ابتدا تیرے نام سے

جس راہ کو بھی دیکھو ترستی ہے نور کو
میں سوچ میں پڑا ہوں جلاؤں کدھر چراغ
اک خواب نے بدل دیا ہجرت کا فیصلہ
مجھ کو دکھا دیے گئے حدِّ نظر چراغ

قارئین کرام! کونپلیں پھوٹنے اور پھول کھلنے کے اس موسم میں آپ سب کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ ملکی صورتحال بے حد حساس ہوگئی ہے۔ بلوچستان میں ہماری مجرمانہ غفلت اور غلط حکومتی اقدامات نے حالات کو بے حد بگاڑ دیا ہے۔ دوسری طرف امریکی کانگریس میں قرارداد پیش ہونے کے بعد بین الاقوامی سطح پر بھی بلوچوں کے حقوق کے حوالے سے بہت زیادہ چرچا شروع ہوگیا ہے۔ بلوچستان کی حق تلفی میں ہمیشہ ہماری حکومت کی پشت پر مغربی طاقتیں ہی سرگرم عمل رہی ہیں اور اس کا سلسلہ گزشتہ ۶۳ سال سے جاری ہے۔ حالات کو موجودہ نہج تک پہنچانے میں جنرل مشرف کی پالیسیوں کا بے حد دخل رہا۔ امریکہ ہی کے احکام کی بجا آوری کے لیے بلوچستان میں بے رحمانہ فوجی کارروائی کی گئی اور آج بھی امریکہ کو بلوچی عوام سے نہیں، بلوچستان کے وسائل اور اپنے مفادات سے غرض ہے۔ انتہائی دکھ کی بات ہے کہ محض چالیس برس کے وقفے سے ملک کے ایک اور حصے میں غلطیوں کی وہی تاریخ دہرائی جارہی ہے جس کی بنا پر پہلے بھی ہمارا دشمن ہم پر کاری وار کر چکا ہے، جبکہ ابھی وہ سانحہ یادداشتوں میں کل کے واقعے کی طرح تازہ ہے اور اس سے اب بھی خون رستا ہے۔ وہ لوگ ابھی زندہ ہیں جنھوں نے پاکستان کو دولخت ہوتے دیکھا اور اس دوران مثبت یا منفی کردار ادا کر کے تاریخ کو گواہ بنایا۔ آج پھر ہم اپنے جسم کے ایک حصے پر خود ہی وار کر کے اسے لہولہان کر رہے ہیں۔

کب تک کوزہ گری کے فن سے ناواقف ہم ٹھہریں گے
مٹی گوندھے رکھتے ہیں اور چاک چلائے رہتے ہیں

آج بھی اگر بلوچ عوام کو قومی دھارے میں واپس لانا ہے تو وہاں جاری فوج کشی، سیاسی کارکنوں کے اغوا اور قتل کے سلسلوں کو فوری بند کرنا ہوگا اور موثر مذاکرات کا راستہ اپنانا ہوگا ورنہ بلوچ عوام کے ساتھ ہمارے فاصلے دن بدن بڑھتے چلے جائیں گے۔ اس کے بعد ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ کرنا اور ان کے وسائل پر ان کے حق کو تسلیم کرنا وہ کم از کم اقدامات ہیں جو بلوچستان کے حالات درست کرنے کے لیے فوری طور پر اٹھانے ضروری ہیں۔

ملکی سلامتی کے خلاف سازشوں کا یہ سلسلہ بلوچستان ہی پر موقوف نہیں بلکہ اب اس کا دائرہ کوہستان اور گلگت تک بڑھتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ جہاں فرقہ وارانہ فسادات کے نام پر ٹارگٹ کلنگ میں بے گناہوں کو شہید کیا گیا۔ اگلے ہی روز جنرل کیانی نے علاقے کا دورہ کیا اور فوجوں کو الرٹ رہنے کا حکم دیا جبکہ یہ شمالی سرحدیں ہماری محفوظ ترین سرحدیں ہیں۔ جہاں فلک بوس پہاڑوں کی شکل میں قدرت خود ہماری حفاظت کرتی ہے۔ تو کیا یہ تیاری کسی ممکنہ بدامنی، دہشت گردی یا خانہ جنگی کی طرف اشارہ کرتی ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر انٹیلی جنس کے ذرائع سے شر پسند عناصر کی سرکوبی کیوں نہیں ہوسکتی؟ ایران سے گیس پائپ لائن کی بات شروع ہوتے ہی شیعہ سنی فسادات کا آغاز اور سات سمندر پار سے ہیلری کلنٹن کی ہرزہ سرائی اور دھمکیاں ..... واقعات کی یہ ترتیب بے معنی نہیں ہے۔ ایران سے ہمارے کسی قسم کے تعاون پر امریکہ سے زیادہ کس کو تشویش ہوسکتی ہے۔ کئی

جائزوں سے یہ بات بھی سامنے آ چکی ہے کہ توانائی کا بحران بھی ہمارا خود ساختہ ہے اور اس کے پیچھے بھی خاص قسم کے نفسیاتی اثرات پیدا کرنا مقصود ہے۔ بدقسمتی سے جو لوگ اس ملک کی تقدیر کے مالک بنے بیٹھے ہیں وہ پوری طرح امریکہ کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔

اس صورتحال میں بہتری کی امید عوام کے علاوہ اور کس سے لگائی جائے؟ اور عوام کا حال یہ ہے کہ مہنگائی اور بے روزگاری کے ہاتھوں پس رہے ہیں۔ بجلی اور گیس کی فراہمی نہ ہونے سے صنعتیں بند ہو رہی ہیں اوپر سے پٹرول، سی این جی اور مٹی کے تیل کی قیمتیں ایک بار پھر بڑھا دی گئی ہیں۔ بجلی کا بل بقایاجات کے ضمن میں ڈیڑھ گنا آنے کی نوید سنا دی گئی ہے۔ رہ رہ کر افتخار عارف کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

مقدر ہو گیا ہے بے درودیوار رہنا
کہیں طے پا چکا ہے شہر کا مسمار رہنا

چوہدری نثار علی خان نے پیپلز پارٹی کی حکومت پر الزام عائد کیا ہے کہ وہ پبلک فنڈز کو استعمال کر کے میڈیا پر اثر انداز ہونے کے منصوبے پر عمل پیرا ہے۔ وہ اپنے وزیراعلیٰ کے بارے میں کیا فرمائیں گے جو پنجاب کے طلبہ میں مفت لیپ ٹاپ تقسیم کرنے کا اعلان کر چکے ہیں۔ گویا ایک ایک ووٹ پچاس پچاس ہزار روپے میں خریدا جا رہا ہے اور وہ بھی حکومتی پیسے سے۔

شرمین چنائے کا آسکر وصول کرنا کچھ حلقوں کے نزدیک قابل فخر ہوگا، ہمیں تو پروین شاکر کی یاد آئی جس نے کہا تھا۔

تہمت لگا کے ماں پہ جو دشمن سے داد لے
ایسے سخن فروش کو مر جانا چاہیے

تہمت لگانے کو تماشا لگانے سے بدل لیں۔ محترمہ وطن کی بدصورتی کو دشمنوں کے ہاتھوں سے ساری دنیا میں اچھالنے کی بجائے یہیں رہ کر اصلاح کے لیے کام کرتیں تو زیادہ اچھا ہوتا۔ ایسے لوگ موجود ہیں جو ظلم کا شکار ان عورتوں کے لیے بڑے جذبے کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ ان میں مسرت مصباح خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ دستاویزی فلم پہلے پاکستان میں تو دکھائی جاتی تاکہ یہاں لوگوں میں آگاہی پیدا ہوتی۔ مسلم دنیا خصوصاً پاکستان میں انسانی حقوق اور عورتوں کی حیثیت کے بارے میں منفی پراپیگنڈہ اس وقت مغرب کے سیاسی ایجنڈے کا ایک اہم نکتہ ہے۔ بھارت میں عورت کی حالت زار پر حقائق اور اعداد و شمار انتہائی لرزہ خیز ہیں، مگر وہاں کے لوگ اپنے ملک کا تماشا نہیں بناتے اور نہ ہی بھارت کا برا امیج دینا بین الاقوامی ایجنڈے کا حصہ ہے۔ مگر پاکستان کے بارے میں چن چن کر منفی واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے اور ہمارے ہی سادہ لوح لوگ ان کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ خواہ وہ ایک دیہاتی مختاراں مائی ہو یا اعلیٰ تعلیم یافتہ شرمین چنائے۔

سندھ میں پیپلز پارٹی کی انتخابی امیدوار وحیدہ شاہ کا خواتین کوزدوکوب کرنا بھی ایک ایسا شرمناک واقعہ ہے جس کو ہمارے میڈیا نے خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ بدقسمتی سے ہماری بڑی اور موروثی سیاسی پارٹیوں کا یہی کلچر ہے، جس منظر کو کیمرے کی آنکھ نے محفوظ کر لیا وہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا۔ پھر ایک ہزار بار وہ منظر سکرین پر دہرائے جانے کے باوجود پارٹی کی جانب سے کوئی انضباطی کارروائی عمل میں نہیں آئی۔ ۸ مارچ عالمی یومِ خواتین کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ دن بطور خاص ہمیں خواتین کے حقوق اور ان کی عزت و احترام کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ محض میڈیا میں ان کو تماشا بنا دینا تو ایک اور حق تلفی ہے جو عورت کے ساتھ روا رکھی جا رہی ہے۔ اسی طرح عورتوں کا اشتہارات میں ''سیکس سمبل'' کے طور پر استعمال ان کے استحصال کی بدترین شکل ہے۔ خصوصاً فون سروس اور موبائل کمپنیوں کے اشتہارات نے آج ہر گھر میں اہل خانہ کا ایک ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھنا مشکل بنا دیا ہے۔ خواتین کے حقوق پر آواز اٹھاتے ہوئے ہمیں ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی ضرورت ہے۔

دعاؤں میں یاد رکھیے ۔ صائمہ اسما

صبر

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ. (البقرہ۲:۱۵۳)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

معنی و مفہوم

صبر کے لغوی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں۔ درحقیقت صالح اہل ایمان کی پوری زندگی صبر کا نمونہ ہے۔ صبر سے مراد اپنی خواہشات اور جذبات پر قابو رکھنا، گناہ کی ساری لذتوں سے پرہیز کرنا، نیکی اور راستی کے ہر نقصان اور اس کی بدولت حاصل ہونے والی ہر محرومی کو انگیز کر جانا، شیطان کی تمام ترغیبات اور نفس کی تمام خواہشات کے علی الرغم فرض بجا لانا اور دین حق کو قائم اور سربلند کرنے کی جدوجہد میں ہر قسم کے مصائب اور تکلیفوں کو سہہ جانا، غرض تنہا اس ایک لفظ میں دین، دینی رویے اور دینی اخلاق کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ (تفہیم القرآن)

خدا کی طرف سے آزمائش نعمت کی صورت میں آئے یا مصیبت کی صورت میں، صابر دراصل وہ شخص ہے جو ہر حال میں صراطِ مستقیم پر قائم رہے خوشحالی میں بہک نہ جائے اور مصائب و مشکلات کے ہجوم میں خدا سے غافل ہو کر نازیبا حرکات نہ کرنے لگے۔

راہِ دعوت کا توشہ

قرآن میں بتکرار صبر کا تذکرہ ہوا ہے۔ اللہ کے علم میں تھا کہ دعوتِ اسلامی کے علمبرداروں کو صبر کی بے حد ضرورت ہے کیونکہ یہ راستہ طویل اور پر مشقت ہے، کانٹوں سے پر اور مشکلات سے اٹا پڑا ہے جگہ جگہ ابتلا و آزمائش ہے۔ ہر موقع ایسا ہے جس میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے نفس کی مرغوبات پر صبر، ہر قسم کی لالچوں اور آرزوؤں پر صبر، اپنے ضعف اور نقص پر صبر، لوگوں کے جہل اور بری سوچ پر صبر، نفس کی جلد بازی اور افسردگی پر صبر، راستے کی طوالت پر صبر، جب غلبہ نصیب ہوتا ہے تو سنجیدگی اور بردباری کا دامن تھامنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس وقت پھر صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس راہ میں ایسی ایسی مشکلات اور حالات پیش آتے رہتے ہیں جن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان مشقتوں کا مفہوم کلمات کے جامہ میں نہیں سماتا۔ اس مفہوم کا ادراک وہی شخص کر سکتا ہے جس نے اس راہ کی مشقتوں کو انگیز کیا ہو اور ان تلخ تجربوں سے خود گزرا ہو۔ بے صبرا انسان اس راہ پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔

صبر کے سرچشمے

نماز جب صبر طویل ہو جاتا ہے اور تھکاوٹ بڑھ جاتی ہے تو انسان رنج و ملال کا شکار ہو جاتا ہے اور قوتِ صبر کمزور پڑنے لگتی ہے لہٰذا صبر کے ساتھ ساتھ نماز کی بھی تلقین کی جارہی ہے۔ نماز منبع تجدید قوت ہے۔ نماز وہ سرچشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہوتا اور وہ زادِراہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ انسان فانی اور محدود قوت کا مالک ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قوتِ کبریٰ سے لو لگائے۔ نماز بندے اور رب کے درمیان ایک خاص ملاقات ہے اس سے دل غذا لیتا ہے اور روح ایک خاص تعلق کا احساس کرتی ہے اس کے اندر نفس انسانی کے لیے وہ سروسامان ہے جو دنیا کے تمام مال ومتاع سے زیادہ قیمتی ہے۔

نبیؐ پریشانیوں کے ہجوم میں نماز کثرت سے پڑھنا شروع کر دیتے یہ رات کا قیام جو آغازِ دعوت ہی میں فرض کر دیا گیا تھا اس کی حقیقت کیا تھی؟ یہ بھاری کلام اور اس عظیم ذمہ داری کے لیے تیاری اور تربیت تھی جس کی راہ مصائب وشدائد سے پُر تھی۔ یہ سرچشمۂ خیر و برکت اب بھی ہر مومن کی دسترس میں ہے جو ایسے حال میں مدد کا طلبگار ہو جب ہر قسم کی مدد منقطع ہوگئی ہو اسے چاہیے نماز ہی کی طرف رجوع کرے۔ یہ اللہ کے ان خزانوں کی کنجی ہے جو مستغنی کر دیتے ہیں۔ جھولی بھر دیتے ہیں اور رحمتوں کی بارش کر دیتے ہیں۔

تعلق باللہ

تعلق باللہ ہی انسان کو ذاتی انتقام اور بدلہ لینے کے مقابلے میں صبر پر آمادہ کرتا ہے۔ اللہ صابرین کی مدد کرتا ہے انھیں ثابت قدمی اور عزت عطا کرتا ہے۔ انھیں کٹھن سفر میں اکیلے نہیں چھوڑتا جب وہ تھک کر چور ہو جائیں اللہ انھیں از سرِ نو قوت عطا کرتا ہے صبر اور ضبطِ نفس کی توفیق بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے۔ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ (النحل ۱۲۶) ''اور تمھارا صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔''

ارشادِ نبویؐ ہے: جو شخص صبر کرنے کی کوشش کرے گا خدا اُس کو صبر بخشے گا۔ صبر سے زیادہ بہتر اور بہت سی بھلائیوں کو سمیٹنے والی بخشش اور کوئی نہیں۔ (بخاری و مسلم)

راہِ حق کی اذیتیں صرف اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کو نوازنے اور بلندیٔ درجات کے بہانے ہیں ورنہ اللہ اپنے دین کی نصرت کے لیے کسی کا محتاج نہیں۔ ارشادِ نبویؐ ہے: آزمائش جتنی سخت ہوگی اتنا ہی بڑا انعام ملے گا (بشرطیکہ انسان صبر کرے) اور اللہ تعالیٰ جب کسی گروہ سے محبت کرتا ہے تو اُن کو مزید نکھارنے اور صاف کرنے کے لیے آزمائشوں میں ڈالتا ہے۔ پس جو لوگ خدا کے فیصلے پر راضی رہیں اور صبر کریں تو اللہ اُن سے خوش ہوتا ہے اور جو لوگ اس آزمائش سے ناراض ہوں تو اللہ بھی اُن سے ناراض ہو جاتا ہے۔ (ترمذی)

ارشادِ ربانی ہے: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ (۱۴۶:۳) ''اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' یہ حقیقت کہ اللہ صابروں کو محبوب رکھتے ہیں نہایت ہی موثر ہے۔ یہ اللہ کی محبت اور پیغامِ محبت تمام دردوں اور تمام دکھوں کے لیے مرہم ہے۔ اس سے تمام زخم مندمل ہو جاتے ہیں اور تمام تلخیاں اور تھکاوٹیں ختم ہو جاتی ہیں۔

آیت زیرِ نظر میں صبر کے دو بڑے سرچشموں کا ذکر

ہے۔قرآن و حدیث میں کچھ دوسرے نکات کی طرف بھی اشارے موجود ہیں جو صبر میں معاونت کرتے ہیں۔

اجر وثواب کا تصور

اللہ تعالیٰ انسانی نفسیات کے نشیب و فراز کے اندر گہرائیوں تک پائے جانے والے احساسات کو جانتا ہے، وہ جانتا ہے کہ صبر انسانی نفس پر بہت بھاری اور ناپسندیدہ ہے۔ ضعیف انسان پر اپنی خواہشات اور جذبات کی قربانی نہایت ہی گراں ہے لہٰذا اُس نے اس نیکی کا اجر بھی بے حد مقرر فرما دیا۔ ارشادِ ربانی ہے۔ اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَاب۔(الزمر۔10)

اللہ تعالیٰ کے ہاں سے اجر عظیم کا یقین نفس پر صبر کی سختی کو آسان اور دل پر اس کے بوجھ کو ہلکا کر دیتا ہے، جس قدر یہ یقین زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی غم کا احساس کم ہو جاتا ہے، صبر کی کمی دراصل اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھے اجر کے یقین کی کمزوری کی علامت ہے۔

دنیاوی زندگی کی بے ثباتی

زندگی ایک مختصر سا وقفہ ہے بہت ہی مختصر! اس مختصر سے وقفے کو اگر کانٹوں پر بھی کاٹ لیں گے تو کوئی فکر کی بات نہیں کیونکہ اس کو ہماری توقع سے بہت پہلے ختم ہو جانا ہے۔ خوش نصیب ہے وہ بندہ کہ جب موت اس کو آئے تو اُسے اپنے فرض کی ادائیگی میں مصروف و منہمک پائے۔ اس وقت اس کا آنا اس جانے والے کے لیے کتنا خوش آئند ہوگا اور کس طرح اس کا دل مسرت سے پکار اٹھے گا ''لو! یہ مشقت کا دن تو گزر بھی گیا.....! بس اتنی ہی سی تو بات تھی۔ (داعی کے اوصاف)

اپنے نفس کی پہچان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن لوگوں کو کوئی مصیبت پہنچ جائے اور وہ اس وقت اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر عظیم کی خوشخبری اور ہدایت و رحمت ہے۔ دراصل انسان اول و آخر اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اس کے پاس موجود ہر نعمت اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے۔ اگر کوئی مصیبت نازل ہو اور کوئی چیز چھن جائے تو اس کی حقیقت فقط اتنی ہے کہ مالک نے اپنی بعض ودیعت کردہ چیزیں واپس لے لیں۔ ظاہر ہے کہ مالک کو کچھ چیزیں واپس کرنے پر رنج و غم اور ناراضگی محسوس کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں۔ آخر کار انسان اپنے نیک و بد اعمال ساتھ لیے ہوئے اپنے رب کی طرف لوٹ جائے گا اور یہ سب نعمتیں اس سے چھن جائیں گی۔ اگر یہی انسان کی ابتداء و انتہا ہے تو پھر کسی چیز کی موجودگی پر خوشی کے کیا معنی اور کسی چیز کے چھن جانے پر غم کیسا؟

تاریخ سے سبق

قرآن میں داعیانِ حق کو تقویت دینے کے لیے پچھلے انبیاء اور ان کے متبعین کا جگہ جگہ تذکرہ موجود ہے۔ ان پر جو مشکلات پڑیں جو مصائب و شدائد پیش آئے، وہ جس درد و الم میں مبتلا ہوئے وہ آج کے دور کی مشکلات سے کچھ کم نہ تھا لیکن وہ نہ تو کمزور بن کر دشمنوں کے سامنے جھکے اور نہ مشکلات کے آگے گھٹنے ٹیک کر جدوجہد سے کنارہ کش ہوئے۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں ایک بار حضورؐ کسی نبیؑ کی کہانی بیان کرتے تھے گویا

میں اب بھی انھیں دیکھ رہا ہوں ان کی قوم نے انھیں مارا اور لہو لہان کر دیا وہ اپنے چہرے سے خون صاف کر رہے تھے اور فرما رہے تھے ''اللہ میری قوم کو معاف کر دے اور یہ لوگ جانتے نہیں۔'' (بخاری و مسلم)

حرفِ آخر

اے دلِ نادان! تو سمجھتا کیوں نہیں یہ چند گھڑیاں ہی تو ہیں اگر صبر سے گزار لے تو پھر موت کے بعد بفضل ربی ہر طلب پوری ہوگی، ہر خواہش بھر آئے گی۔

(فی ظلال القرآن، تفہیم القرآن، داعی کے اوصاف از بنت الاسلام، صبر از ڈاکٹر محمد ابراہیم)

بچوں کے حقوق

بچے ان عظیم نعمتوں میں سے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہیں ۔ ہر انسان کے دل میں بچوں کی خواہش فطری طور سے رکھ دی گئی۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت زکریاؑ کی اولاد کیلئے دعاؤں کا ذکر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے عرض کیا۔'' اے میرے رب مجھے صالح فرزند عطا فرما'' (الصٰفٰت ۱۰۰)۔ حضرت زکریاؑ نے یوں دعا کی ۔'' اے میرے رب مجھے اپنی طرف سے نیک اولاد عطا فرما ۔ بیشک تو دعائیں سنتا ہے'' (آل عمران ۳۸) والدین کیلئے بچوں کے عظیم نعمت ہونے کے ساتھ ان کے بارے میں والدین پر بہت ذمہ داریاں بھی ہیں ۔ بچہ اہمیت چاہتا ہے، خوراک چاہتا ہے، محبت اور نگہداشت، بہترین صحت اور بیماریوں سے علاج ،تعلیم ، معاشی استحکام ، معاشرتی تعلقات کی تربیت اور حقوق، رہنمائی اور ہدایت کے ساتھ عمل کیلئے بہترین نمونہ دینا والدین کے فرائض میں شامل ہیں۔شریعت نے بچوں کے مندرجہ ذیل حقوق مقرر کئے ہیں۔

ا۔اعترافِ نعمت

اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر والدین کے دلوں میں بچوں کی محبت ڈال دی ہے ۔قرآن کریم میں فرمایا،'' لوگوں کیلئے مرغوبات نفس ،عورتیں اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنا دی گئیں ۔(آل عمران ۔۱۴)۔لیکن صحیح خوش نصیبی صالح اولاد کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے جیسے حضرت مریمؑ کو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کی خبر دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا،'' اور اسے ہم لوگوں کیلئے ایک نشانی بنا دیں گے اور اپنی طرف سے ایک رحمت'' (مریم ۔۲۱) اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ دعا سکھائی ،'' اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔'' (الفرقان ۔۷۴)

اولاد ملنے پر اعترافِ نعمت کا سب سے اہم تقاضا یہ ہے کہ اس پر اللہ کا شکر ادا کیا جائے حضرت ابراہیمؑ کو جب اولاد عطا ہوئی تو انہوں نے اس کا شکر یوں ادا کیا۔

'' شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ جیسے بیٹے دیئے ۔حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا سنتا ہے۔'' (ابراہیم ۔۴۰)

اولاد کی قدر دانی اسلئے بھی ضروری ہے کہ اولاد انسان کے لئے ایک امید کا ذریعہ ہے ۔ بچے بڑھاپے کا سہارا ہیں ، حقیقی اور فطری وارث یہی اولاد ہے ، حضرت زکریاؑ نے اسی لئے ان الفاظ میں اللہ سے دعا مانگی۔'' یا اللہ تو مجھے اپنے فضل

خاص سے ایک وارث عطا کر دے جو میرا وارث بھی ہو اور آل یعقوبؑ کی میراث بھی پائے ، اور اے پرور دگار اسے ایک پسندیدہ انسان بنا۔'' (مریم۔۵،۶)

اولاد آخرت میں نجات کا باعث ہے اور صدقہ جاریہ ہے ۔صحیح مسلم کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا ۔'' جب انسان وفات پا جاتا ہے تو اس کی مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے، سوائے تین اعمال کے، کوئی صدقہ جاریہ جو بعد میں رہے، کوئی ایسا علم چھوڑ جائے کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں اور یا پھر نیک اولاد جو اس کے بعد اس کے لئے دعا کرتی رہے۔''

نعمتِ اولاد کی اہمیت کا اندازہ ان لوگوں کو ہوتا ہے جو بے اولاد ہوں یا جن سے اولاد چھین لی جائے۔جس طرح کوئی بھی نعمت چھن جانے سے انسان رنج محسوس کرتا ہے اسی طرح اولاد چھن جانے سے بھی وہ غمگین ہوتا ہے، اس سے انبیاء بھی مستثنیٰ نہیں تھے ۔حضرت یعقوبؑ کے جب دو بیٹے (یوسفؑ اور بن یامین) ان سے علیحدہ ہو گئے تو غم کے مارے رو رو کر ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ''ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ ابوسیف کے ہاں گئے جو آپؐ کے صاحبزادے ابراہیم کی دایہ کے شوہر تھے۔اس وقت ابراہیمؑ پر نزع کا عالم طاری تھا۔ انہیں دیکھ کر آپؐ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! آپ بھی روتے ہیں ،آپؐ نے فرمایا اے ابن عوفؓ یہ (آنسو) رحمت ہیں ۔اس کے بعد آپ کی آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہو گئے اور آپ نے فرمایا آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور دل غمگین ہے لیکن ہم اپنی زبان سے صرف وہی بات کہتے ہیں جو ہمارے رب کو پسند ہے اور اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے البتہ غمگین ہیں ۔'' (بخاری مسلم)

۲۔نومولود بچہ کے کان میں اذان

رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو رافعؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو (اپنے نواسے) حسنؓ بن علی کے کان میں نماز والی اذان پڑھتے ہوئے دیکھا جب (آپ کی صاحبزادی) فاطمہؓ کے ہاں ان کی ولادت ہوئی (جامع ترمذی، سنن ابی داؤد)

دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے نومولود بچے کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت پڑھنے کی تعلیم دی اور اس کی برکت اور تاثیر کا بھی ذکر فرمایا۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نومولود بچہ کا پہلا حق گھر والوں پر یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کے کانوں اور کانوں کے ذریعے دل و دماغ کو اللہ کے نام، اس کی توحید اور ایمان و نماز کی دعوت و پکار سے آشنا کریں۔اذان و اقامت میں دین حق کی بنیادی تعلیم نہایت مؤثر طریقے سے دی گئی ہے ۔ نیز ان دونوں کی تاثیر اور خاصیت بہت سی احادیث میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے شیطان بھاگتا ہے، اس طرح شیطان سے بچے کی حفاظت کی بھی یہ ایک تدبیر ہے۔

۳۔عقیقہ

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ہم لوگوں کا یہ دستور تھا کہ جب کسی کے لڑکا پیدا ہوتا تو وہ بکری یا

بکرا ذبح کرتا اور اس کے خون سے بچے کے سر کو رنگ دیتا۔ پھر جب اسلام آیا تو (رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے مطابق) ہمارا طریقہ یہ ہو گیا کہ ہم ساتویں دن بکری یا بکرے کی قربانی کرتے اور بچے کا سر صاف کرا کے اس کے سر پر زعفران لگا دیتے ہیں۔ (سنن ابی داؤد)

ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ ساتویں دن عقیقہ کے ساتھ ہم بچے کا نام بھی رکھتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کے ہاں بچہ پیدا ہو اور وہ اس کی طرف سے عقیقہ کی قربانی کرنا چاہے تو لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری قربانی کرے۔ (سنن ابی داؤد)

اس حدیث میں ''اگر کرنا چاہے'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ عقیقہ فرائض و واجبات کی طرح کوئی لازمی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا درجہ ایک مستحب عمل کا ہے (واللہ علم)۔ اسی طرح لڑکے کے عقیقہ میں دو بکرے (یا بکریاں) بھی کچھ ضروری نہیں ہے، ہاں اگر وسعت ہو تو دو کی قربانی بہتر ہے ورنہ ایک بھی کافی ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے عقیقہ میں ایک ایک بکری قربان کی تھی۔

عقیقہ بچے کی پیدائش پر اللہ تعالیٰ کے حضور شکرانہ ہے اور بچے کی طرف سے صدقہ ہے۔ سر منڈوانے اور قربانی کرنے کے عمل میں خاص ربط ہے اور حج کے حوالہ سے یہ سنت ابراہیمی کے شعائر میں سے ہے اور اس بات کا اعلان ہے کہ ہمارا تعلق ملت ابراہیم سے ہے۔

۴۔ تسمیہ (نام رکھنا)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: باپ پر بچے کا حق ہے کہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کو حسن ادب سے آراستہ کرے۔ (بیہقی)

حضرت ابوداؤدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن تم اپنے اور اپنے باپوں کے نام سے پکارے جاؤ گے لہٰذا تم اچھے نام رکھا کرو۔ (سنن ابی داؤد)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے ناموں میں اللہ کو سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں (مسلم)

سنن ابی داؤد اور دوسری روایات میں آپؐ کا یہ ارشاد بھی مروی ہے کہ ''تم انبیاء کے ناموں پر نام رکھو۔'' آپ نے خود بھی بچوں کے ایسے نام رکھے جو معنوی لحاظ سے اچھے تھے، جیسے حسن اور حسین۔ ایک انصاری صحابی کے بچے کا نام آپ نے منذر رکھا حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کی پہلے شوہر سے ایک بیٹی کا نام ''عاصیہ'' تھا آپؐ نے بدل کر ''جمیلہ'' رکھ دیا (الادب المفرد)

بعض اوقات نبی کریم ﷺ پیار سے پورا نام لینے کی بجائے مختصر نام لیتے تھے، عائشہ کہنے کی بجائے عائش، عثمان کہنے کی بجائے عثم حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے انہیں بتایا کہ ایک روز جب جبریلؑ آئے تو حضورؐ نے فرمایا اے عائشہ جبرئیلؑ تمہیں سلام کہہ رہے ہیں۔ (الادب المفرد)

۵۔تعلیم وتربیت

حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اپنے بچوں کی زبان سے سب سے پہلے ''لا الہ الا اللہ'' کہلواؤ اور (اپنے مرنیوالوں کو) موت کے وقت اسی کلمہ کی تلقین کرو۔ (بیہقی)

حضرت سعید بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی باپ نے اپنی اولاد کو کوئی عطیہ حسن ادب اور اچھی سیرت سے بہتر نہیں دیا۔ (ترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز کی تاکید کرو اور جب دس سال کے ہو جائیں تو نماز میں کوتاہی پر ان کو سزا دو اور ان کے بستر الگ الگ کردو۔ (ابی داؤد)

گھر کی تعلیم میں ماں کا خصوصی حصہ ہے۔ حضرت عبد القادر جیلانیؒ کو ماں نے کہا تھا کہ جھوٹ نہیں بولنا اور جب ڈاکوؤں نے پوچھا تمہارے پاس رقم ہے؟ آپ نے کہاں ہاں چالیس دینار ہیں جو میرے لحاف میں سلے ہوئے ہیں۔ ڈاکوؤں کے سردار نے سچ بولنے کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا ، والدہ نے یہی نصیحت کی تھی کہ بیٹا جھوٹ نہ بولنا۔ اس پر سارے ڈاکوؤں نے توبہ کرلی۔ ابوداؤد میں روایت ہے کہ جس نے قرآن کا علم حاصل کیا، اور اس پر عمل کیا اس کے ماں باپ کو قیامت کے روز ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی روشنی سے بہتر ہوگی۔ پھر تمہارا کیا خیال ہے اس شخص کے عمل کے بارے میں جس کے پاس خود یہ دولت ہو۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ'' اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی اس کی پابندی کرو۔'' (سورۃ طٰہٰ۔۱۳۲)

۶۔حُسن سلوک

ارشاد خداوندی ہے **وقو لو للناس حسنا ط** ،اور تم لوگوں سے بھلی بات کہو (البقرہ۔۸۳) یہ ایک عام حکم ہے اور بچے بھی اس بات کے مستحق ہیں کہ ان سے نرمی کا سلوک کیا جائے۔ بچے بھی توہین کو محسوس کرتے ہیں، ان کی بھی عزت نفس ہوتی ہے، ان کے جذبات اور احساسات بہت نازک ہوتے ہیں۔ ان پر بلاوجہ غصہ کرنا، جھڑکنا، ڈانٹنا، برا بھلا کہنا ان کے ذہن پر مستقل برے اثرات مرتب کرتا ہے، اس سے بچوں میں مایوسی اور اخلاقی پستی پیدا ہوتی ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی اولاد کا اکرام (عزت وتکریم) کرو اور انہیں (اپنے اس عملی نمونے سے) حسن ادب سے آراستہ کرو۔ (سنن ابن ماجہ)

بچے کئی طرح کے سوال کرتے ہیں، ان کے کئی مطالبے ہوتے ہیں لیکن ان کے کسی سوال پر انہیں جھڑکنا نہیں چاہئے۔ **و اما السائل فلا تنھر** کا حکم بچوں کیلئے بھی ہے۔ پھر بچوں سے کئی غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان سے نرمی اور عفو ودرگذر کا رویہ ہی بہتر ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

اگر تم (اپنی بیویوں اور اولاد کے معاملے میں) عفو ودر گذر سے کام لو اور معاف کردو تو بے شک اللہ غفور رحیم ہے (التغابن۔۱۴)

حسن سلوک کے معاملے میں یہ بھی لازم ہے کہ سب بچوں کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جائے۔ بخاری و مسلم میں نعمان بن بشیر سے یہ روایت ہے کہ میرے والد مجھے لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، میں نے اس بیٹے کو ایک غلام ہبہ کر دیا ہے۔ آپؐ نے پوچھا کیا تم نے اپنے سب بچوں کو اتنا ہی دیا ہے، انہوں نے عرض کیا، نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: پھر یہ تو ٹھیک نہیں تم اس ہبہ کو واپس لے لو۔

نبی کریم ﷺ نے بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی کیونکہ دور جاہلیت میں ان سے بہت برا سلوک ہوتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کے ہاں لڑکی پیدا ہو، پھر وہ نہ اسے کوئی ایذا پہنچائے، نا اس کی توہین و نا قدری کرے اور نا محبت اور برتاؤ میں لڑکوں کو اس پر ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ لڑکی کے ساتھ اس کے حسن سلوک کے صلے میں اس کو جنت عطا فرمائے گا۔ (مسند احمد)

۷۔ محبت کا حق

بچوں سے محبت ایک فطری جذبہ ہے جو جانوروں میں بھی موجود ہے۔ ہمارے لئے اس کا برملا اظہار اسوۂ حسنہ کی روشنی میں عین مطلوب و پسندیدہ ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت انسؓ سے ایک روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ابوسیف کے گھر گئے جو آپؐ کے بیٹے ابراہیم کی دایہ کے شوہر تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ابراہیم کو گود میں لیا، پیار کیا، ان کے چہرے پر اپنی ناک اور منہ کو رکھا۔

بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت ہے کہ ایک موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن ابن علیؓ کو چوما اور پیار کیا۔ آپؐ کے پاس اقرع بن حابسؓ بیٹھے تھے، کہنے لگے، میرے دس بچے ہیں لیکن میں نے کبھی کسی بچے کو پیار نہیں کیا۔ آپؐ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

۸۔ حفاظت و نگہداشت

بچے کی جان کی حفاظت والدین کی اہم ترین ذمہ داری ہے ارشاد خداوندی ہے: ''اے نبیؐ جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں اور اس بات پر بیعت کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو۔ یقیناً اللہ درگذر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' (الممتحنہ۔۱۲)

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب رات کی ابتدا ہو تو اپنے بچوں کو روک لو (گھر سے باہر نہ نکلنے دو) کیوں کہ اس وقت شیطان ہر طرف پھیل جاتے ہیں۔ (بخاری)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گھروں اور بچوں کی دیکھ بھال تم عورتوں کی ذمہ داری ہے، اور تمہارا یہی عمل جہاد ہے (مسند احمد)

بچے کی نگہداشت میں اولین عمل اپنے ذرائع کے مطابق بچے کی غذا اور لباس کا انتظام کرنا ہے۔ یہ والدین کی ذمہ داری بھی ہے اور ان کی طرف سے صدقہ بھی۔

ابومسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان جب اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا ہے اور اس سے ثواب کی نیت رکھتا ہے تو یہ بھی اس کیلئے صدقہ ہی شمار ہوتا ہے۔(مشکوٰۃ)

بچے کی پہلی ضرورت ماں کا دودھ ہے۔ارشاد خداوندی ہے کہ ''مائیں بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں'' (البقرہ۔۲۳۳)

بچوں کی صحت کا خیال رکھنا، بروقت علاج کرانا والدین کا فرض ہے جن بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے دستیاب ہیں ان کو بروقت لگوانے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ پولیو کے قطرے بہت اہم ہیں ،لڑکوں کے ختنہ کرانا ان کو بڑی عمر میں کئی بیماریوں سے محفوظ کر دیتا ہے ۔ بچوں کو حفظان صحت کے طریقوں سے بھی آگاہ کرنا ضروری ہے۔کھانے سے پہلے اور بعد ہاتھ دھونا، دانتوں پر برش کرنا، طہارت صحیح طرح سے کرنا، غسل کرنا، ننگے پاؤں باہر جانے سے منع کرنا، یہ سب باتیں ضروری ہیں۔

۹۔روزگار

اولاد کی تعلیم وتربیت میں اس بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ ان کو دین وشریعت اور اخلاقیات سکھانے کے ساتھ ایسی تعلیم بھی دی جائے جو بالغ ہونے پر ان کے روزگار کا ذریعہ بنے۔ یہ بات خاص طور سے لڑکوں کے بارے میں ضروری ہے جن پر آئندہ کفالت کی ذمہ داری پڑنے والی ہے، اس لئے نکاح سے پہلے روزگار کا حصول ضروری ہے۔ ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ حضرت عباسؓ نے اپنے بیٹے فضل اور ربیعہ بن حارث(حضورؐ کے حقیقی چچا زاد بھائی) نے اپنے بیٹے عبدالمطلب کو نبی کریم ﷺ کے پاس بھیجا کہ تم اب جوان ہوگئے ہو، تمہیں جب تک روزگار نہ ملے تمہاری شادیاں نہیں ہو سکتیں، لہٰذا تم رسول اللہؐ کے پاس جا کر نوکری کی درخواست کرو۔

۱۰۔نکاح

فرمان الٰہی ہے'' تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کردو۔''(النور۔۳۲)

حضرت ابوسعید حذریؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کو اللہ اولاد دے تو چاہیے کہ وہ اس کا اچھا نام رکھے، اس کو اچھی تربیت دے اور سلیقہ سکھائے۔ جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو اس کے نکاح کا بندوبست کرے۔ اگر باپ نے شادی کی عمر کو پہنچنے کے بعد بھی اس کی شادی کا بندوبست نہ کیا اور وہ اس وجہ سے حرام میں مبتلا ہوگیا تو اس کا باپ اس گناہ کا ذمہ دار ہوگا۔(بیہقی)

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی ایسا شخص تمہارے پاس نکاح کا پیغام بھیجے جس کے دین اور خلق سے تم راضی اور خوش ہو تو اس کا پیام منظور کر کے (اپنی بچی کا) اس سے نکاح کردو۔ اگر ایسا نہ کروگے تو زمین پر سخت فتنہ برپا ہوگا۔(ترمذی)

☆☆☆

افشاں نوید

خواتین کے حقوق کے

استعماری ایجنڈے!

خبر ہے کہ.....''ویمن کمیشن کو اعلیٰ مرتبہ دے دیا گیا ہے اس کی ممبران کو بھی اکیسویں گریڈ میں تنخواہ ملے گی۔'' ویمن کمیشن جو عورتوں کے حقوق، تحفظ اور نمائندگی کی دعویدار ہے اس کی کارکردگی یہ ہے کہ گزشتہ 15 برس میں اس نے کچھ رپورٹیں شائع کی ہیں کچھ قرار دادیں منظور کرائی ہیں عورتوں کے حقوق پر چند ایک سیمینار منعقد کرائے ہیں۔ ان کی انتھک کوششوں سے کم عمر بچیوں کی شادی، تیزاب پھینکنے اور عورتوں پر تشدد کے خلاف قانون پاس ہوا۔

قانون پاس ہونا بلاشبہ اچھی بات ہے اس قانون پر عملدرآمد کب اور کیسے ہوگا اور کون کرائے گا نیز کیا اسمبلیوں میں بڑی تعداد میں خواتین کا موجود ہونا اور قانون پاس ہو جانا عورتوں کے مسائل کا حقیقی حل ہے.....؟ آیئے حقائق کے آئینے میں اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

گزشتہ ساڑھے چار سال کی اسمبلی کی کارکردگی کے جائزے سے معلوم ہوا ہے کہ قومی اسمبلی کی خاتون ممبران پورے عرصے کے دوران خاموش رہیں کوئی لفظ خواتین کے حقوق کیلئے ان کے منہ سے نہ نکلا یا شاید وہ منتظر ہیں کہ

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے!

کیا یونہی ادا ہوتا ہے اسمبلیوں کی اس ممبر شپ کا حق؟ یہی حال کم وبیش صوبائی اسمبلیوں میں بھی خواتین کی کارکردگی کا رہا۔ جبکہ ان کے جہازوں کے ٹکٹ اور ماہانہ معاوضے کروڑوں میں رہے۔ جو خواتین وحضرات براہ راست انتخاب میں ہار گئے تھے ان کی بیگمات کو منتخب سیٹوں پر نامزد کر دیا گیا۔

اب آیئے قانون سازی کی طرف کہ جو قانون سازی خواتین کے حقوق کے نام پر ہو رہی ہے اس سے واقعتاً خواتین کو کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے۔

خواتین کے حقوق کی ایک این جی او نے کراچی پریس کلب میں ایک رپورٹ پیش کی جس میں یہ روح فرسا حقائق تھے کہ دوران سال صرف صوبہ سندھ میں تشدد اور عصمت دری کے 2 ہزار واقعات ہوئے جن میں 500 سے زائد خواتین ہلاک ہوئیں۔ 280 خواتین صرف ایک صوبہ سندھ میں کاروکاری کے نام پر قتل ہوئیں۔ 150 عورتوں نے خودکشی کی۔ دو درجن عورتیں قبائلی اختلافات کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ رپورٹ کے دوسرے پیراگراف میں بتایا گیا کہ جنوری تا دسمبر 194 خواتین کی اجتماعی عصمت دری کی گئی۔ واضح رہے کہ یہ اعداد وشمار شہر کے تین بڑے اسپتالوں سے لیے گئے ہیں۔ اخبارات میں شائع ہونے والی بے شمار رپورٹیں اس کے علاوہ ہیں۔

وہ جس کے حقوق کیلئے اسمبلیوں میں سیٹوں کی تعداد بڑھوائی جاتی ہے، فائیو سٹار ہوٹلوں میں سیمینار سجتے ہیں، عالمی دن منائے جاتے ہیں، این جی اوز جس کے دکھوں کے مداوے کیلئے بیرون ملک سے کروڑوں روپے کی فنڈنگ کرتی ہیں، ہر سیاسی پارٹی کا منشور جس کو حقوق دلوانے کی ضمانت سے عبارت ہے اس کی حقیقی صورتحال یہ ہے۔ وہ بلند و بانگ دعوے اور قانون سازی اس ایک رپورٹ سے عیاں ہے۔

یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ اگر ایوانوں میں خواتین کی تعداد بڑھانے اور ان کے لیے قانون سازی کرنے اور ویمن کمیشن کو اعلیٰ مرتبہ دینے سے خواتین کے مسائل حل ہو سکتے تو جدید تہذیب کے حامل ترقی یافتہ ممالک میں خواتین سو فیصد حقوق یافتہ و مراعات یافتہ ہوتیں وہاں خواتین کی شرح خواندگی سو فیصد اور خواتین ہر تشدد سے محفوظ ہوتیں۔

ایک امریکی ادارے American institute of Domestic Violence کی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں 50 لاکھ کے لگ بھگ عورتیں سالانہ مردوں کے تشدد کا شکار ہوتی ہیں اس تعداد کی نصف اپنے شوہر یا بوائے فرینڈ کے ہاتھوں قتل یا زخمی ہوتی ہیں اور 35 فیصد عورتیں ایمرجنسی وارڈ میں جسمانی تشدد کی وجہ سے آتی ہیں۔ یہ ان ممالک کی کارکردگی رپورٹ ہے جہاں ایک ٹیلیفون کال پر پولیس گھر پہنچ جاتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ معاشرہ مغربی ہو یا مشرقی، ترقی یافتہ ہو یا پسماندہ جہاں بھی تمدن کی بنیاد مرد و عورت کی مساوات اور محض ''قانون سازی'' پر رکھی جائے گی وہاں سماج کی بنیادیں اسی طرح کھوکھلی ہونگی اور معاشرہ استحصالی معاشرہ ہو گا جو جسمانی قوتوں کے انحطاط کے ساتھ ذہنی و نفسیاتی امراض کی آماجگاہ ہوگا۔

نبی پاکؐ نے جب اصلاح معاشرہ کی تحریک کا آغاز کیا تھا تو قانون سازی کو بنیاد نہیں بنایا تھا۔ اعلانات یا آرڈیننس جاری نہیں کیے تھے بلکہ ایک اخلاقی اپیل تھی جس کے جواب میں ایک عہد و پیمان تھا اسلام کی متوازن اور ابدی تعلیمات وہ لائحہ عمل تھا جس پر عمل کرنا حب رسول اور قانون ٹھہرا۔ جہاں عورتوں کے حقوق اور تحفظ کی دہائی نہیں تھی۔ کوئی کمیشن اور فورس نہیں تھی بلکہ بنیاد مودت اور رحمت تھی اور فرائض کی ادائیگی اور جوابدہی کا احساس ہی وہ محرک تھا جو لوگوں کو حدود کا پابند بناتا تھا۔

فی الوقت خواتین کی فلاح کیلئے جو اقدامات کیے جا رہے ہیں اور جس راستے کا انتخاب کیا جا رہا ہے وہ خود بگاڑ کا راستہ ہے کیونکہ نہ ہی وہ الہامی تعلیمات کے مطابق ہے نہ ہی لفظ توازن کی تشریح کرتا ہے۔ بلکہ معاشرے میں خواتین کے ''نئے کردار'' کو متعین کیا جا رہا ہے اور خاص اصطلاحات استعمال کی جا رہی ہیں جس کے اطلاق میں اقوام متحدہ کا بہت کردار ہے۔

مثلاً Gender Equality یعنی عورت وہی کام کرے جو کام مرد کرتا ہے۔ اور مرد و زن کی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ وہ پٹرول پمپ پر فیول بھرے۔ ٹریفک وارڈن کی حیثیت سے ذمہ داری سرانجام دے۔ فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں خدمات سرانجام دے۔ عورتیں ہسپتالوں میں ڈاکٹروں سے ملاقاتیں کریں (تن تنہا جا کر) اور ان سے میڈیکل سٹور اور فارمیسی

میں دواؤں کے آرڈر حاصل کریں، سپر اسٹورز پر سیلز گرل کی حیثیت سے بھاگتی دوڑتی پھریں صارفین کے پیچھے اور آزادی وترقی کے متوالے اسے معاشی ترقی اور مساوات مرد وزن کا نام دیں۔قرآن ایک کلیہ بیان کرتا ہے کہ ''جو ہمارے ذکر سے منہ موڑے گا (بغاوت کرے گا ہمارے دیئے ہوئے اصولوں سے) اس کی معیشت تنگ کر دی جائے گی۔'' عورت کا مذکورہ کردار ان ضابطوں کو پامال کر کے الہامی تعلیمات سے بغاوت کرتے ہوئے متعین کر دیا گیا ہے۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ ترقی کے اس راستے پر چل کر کیا یورپ کو آسودگی نصیب ہوئی یا وہاں اخلاقی قدریں پامال ہوئیں اور سماج افراتفری کا شکار ہو گیا۔

دنیا بھر میں عورت کی ترقی اور تحفظ کے نام پر جو بھی اقدامات کیے جا رہے ہیں ان سے عورتوں کو کتنا حقیقی فائدہ ہوا؟ اقوام متحدہ میں 2011ء کی عالمی کانفرنس برائے جنوبی ایشیا کی اس رپورٹ سے اس امر کا اندازہ کر لیجئے کہ ''دنیا کی آبادی کا 51 فیصد خواتین پر مشتمل ہے اور خواتین کی 66 فیصد تعداد ملازمت کرتی ہے مگر آمدنی 10 فیصد حاصل کرتی ہیں اور ایک فیصد سے کم عورتیں جائیداد کی مالک ہوتی ہیں۔''

اسلام جن خواتین کو رول ماڈل کے طور پر پیش کرتا ہے وہ حضرت مریمؑ، حضرت خدیجہؓ، حضرت آسیہؓ، حضرت فاطمہؓ ہیں۔جن کی زندگیوں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کا کردار یہ نہیں کہ وہ اپنے حقوق کے تحفظ کیلئے چادر اور چاردیواری کا تقدس پامال کر دے بلکہ ایک صحت مند معاشرے میں مرد ہی عورت کے حقوق کا محافظ اور نگران ہوتا ہے اور عورت مرد اور خاندان کی معاون اور وہ اپنے خاندان اور گھر کے ساتھ کوئی سماجی خدمت انجام دینا چاہتی ہے اللہ کی حدود کا خیال رکھتے ہوئے تو قرآن ہرگز اس پر کوئی قدغن نہیں لگاتا بلکہ کہتا ہے کہ ''جو کچھ مردوں نے کمایا وہ ان کیلئے ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ان کے لیے'' یعنی ہر ایک کے درجے بغیر جنس کی تخصیص کے اس کی سعی سے مرتب ہوں گے۔

خواتین کی ترقی کے موجودہ ایجنڈے سراسر دھوکا اور فریب ہیں۔اور خواتین کا یہ ''انجینئرڈ کردار'' نہ تو مادی آسائش کا ضامن ہے اور نہ روحانی آسودگی کا۔اسلامی تعلیمات کے مطابق جو ضابطے متعین کیے جائیں گے وہی انسانیت کی فلاح کے ضامن ہونگے۔فی الوقت تو استعمار کے ایجنڈے اور میڈیا پر عورت کی بے توقیری دیکھ کر لگتا یوں ہے کہ

الیاسؔ حال یہ ہے کہ اب پوچھتا ہوں روز
یہ اپنا گھر ہے یا میں کسی اور گھر میں ہوں

☆☆☆

نعت

مرے لب پہ رہتی ہے مدحت تمہاری
یہ توفیق بھی ہے عنایت تمہاری

منور کیا سارے عالم کو تم نے
ہے بے مثل تنویر رحمت تمہاری

ہے فخر دو عالم فقیرانہ اسوہ
ہے رشک سلاطین عظمت تمہاری

کشادہ دلی ہے غریبوں کی خاطر
تواضع فقیروں کی عادت تمہاری

مساواتِ انساں کا اعلان کر کے
رہی اک نمونہ حکومت تمہاری

کیا رام دشمن کو پہلی نظر میں
کرشمہ ہے چشمِ محبت تمہاری

یہ اسرارؔ مدحت سرا ہے تمہارا
رگِ جاں ہے مرہونِ منت تمہاری

اسرار احمد سہاوری

(''ذوقِ عرفان'' سے، انتخاب: محمودہ شیروانی)

خزاں رسیدہ شاخ کی دُعا

(ایک بےاولاد خاتون کی فرمائش پر)

لمحوں کی رفتار سے لرزاں سوکھی شاخ اُداس کھڑی ہے
چھوٹی چھوٹی ننگی بانہیں پھیلا کر کچھ مانگ رہی ہے
صحنِ باغ میں ویرانی ہے چھائی ہے گھمبیر اُداسی!
پت جھڑ ہے اور ننگی شاخیں کہاں گئے اِس چمن کے باسی
سوکھے پتوں کو سرکا کے ہوا کا جھونکا گزرا سَن سے
سناٹے میں کانچ کا سپنا ٹوٹ گیا ہو جیسے چھن سے
ٹوٹے سپنوں کی یہ کرچیں نس نس میں کیوں در آتی ہیں
دل سے رِستے لہو کی بوندیں زہریلی کیوں بن جاتی ہیں
کب تک ان سناٹوں میں، میں بیتی رہوں یہ زہر کے پیالے
کب تک ان اندھیاروں میں، میں ڈھونڈوں گی کرنوں کے اُجالے
جیون کی سوکھی ڈالی پہ کیا کوئی کونپل پھوٹ سکے گی!
کوئی شگوفہ مہکے گا کیا، کیا یہ شاخ کبھی پھل دے گی
سوکھی شاخ ابھی تک جس نے کاغذ کے پھولوں کو سجا کے
اپنا ننگ چھپانا چاہا، خود کو، اوروں کو بہلا کے
کاغذ کے بن باس شگوفے مہک سکے نہ اِس ڈالی پر!
سج مج کے خوش رنگ پرندے چہک سکے نہ اس ڈالی پر
سوکھی شاخ ہاتھوں کو اٹھائے شام ڈھلے کچھ مانگ رہی ہے
ایسے شگوفے دیدے یارب جن میں تیری باس بسی ہے
تیری خوشبو سے جو سارے عالم کو مہکا کر رکھ دیں
تیرے نور سے روشن ہوں جو، دنیا کو چمکا کر رکھ دیں

ڈاکٹر نزہت اکرام

شمیم فاطمہ

بیٹیاں

بیٹیوں کی پیدائش.....!
دورِ جاہلیت میں،
طنز اور طعنہ تھی،
طوق اور گالی تھی،
درد و غم کا باعث تھی،
بے کلی کا سودا تھی،
دورِ جاہلیت میں،
ان حقیر جانوں کا
قتلِ عام جائز تھا،
پھر خدائے برتر نے،
اس حقیر ہستی کو،
اِس وجودِ مبہم کو،
ایک مرتبہ بخشا،
عظمت و سعادت دی،
نام اور وراثت دی
خاتمِ رسالتؐ نے،
بیٹیوں کو عزت دی،
ان جگر کے گوشوں کو،
بے مثال شفقت دی،

ان کی تربیت پہ بھی،
آپؐ نے توجہ دی،
رحمتِ دو عالمؐ نے،
ان جگر کے گوشوں کو،
رحمتِ خدا جانا!
آج.....! آگہی کا دور!
آج علم کا چرچا!
اس رسولؐ سے نسبت!
اسؐ کی چاہ کا دعویٰ!
اور بنتِ حوا کی،
آج بھی وہ پامالی!
آج بھی وہ بدحالی!
آج بھی وجود اس کا،
ناگوار! ناز یبا!
آج بھی جنم اس کا،
اک کلنک کا ٹیکہ!
فکر و رنج کا سودا!
خوف کی علامت ہے!
(بیٹیوں کے جننے پر

بے قصور ماؤں کو
آج بھی تو ملتی ہے
اس طلاق کی لعنت
جو خدائے برتر کو
ناپسند بے حد ہے)
آج بھی محبت کو
بیٹیاں ترستی ہیں
اپنی نارسائی پر
بیٹیاں سلگتی ہیں،
آج بھی وراثت میں،
ان کو حق نہیں ملتا!
کوئی ان کی باتوں کو،
آج بھی نہیں سنتا!
فیصلے کا حق ان کو
آج بھی نہیں حاصل!
آج بھی تو چارہ گر،
بیٹیوں کے ہیں قاتل!

❁❁❁

امن واماں سوغات ہے

ہاں معاف میں نے بھی کیا
اور معاف تو نے بھی کیا
گو دیر کافی ہو گئی
پھر بھی بہت اچھا کیا
رِستے ہوئے جو زخم ہیں
ان کو مگر کیوں نہ سیا
کیا صورت حالات ہے
یہ سوچنے کی بات ہے

تیری یہ حسرت آرزو
ڈھل جاؤں تجھ میں ہو بہو
اور جاں سپاری کا تری
چرچا کروں میں کو بکو
ماؤں کی زخمی کو کھ سے
بہتا رہے چاہے لہو
کیا جیت ہے کیا مات ہے
یہ سوچنے کی بات ہے

گھر میں ترے آبِ رواں
پیاسی رہے میری زباں
بارش مرے گھر جب بھی ہو
پرنالے کھولے نا گہاں
پھر ڈوب جانے کا مرے
سینے میں رکھے خوش گماں
ہے دوستی؟ یا ہات ہے
یہ سوچنے کی بات ہے

وعدہ بِسر جاتا ہے تو
کہہ کے مکر جاتا ہے تو
خوئے تلوّن اس قدر
پل میں بپھر جاتا ہے تو
گھر کیسے اپنا کھول دوں
حد سے گزر جاتا ہے تو
بن دیکھے دن یا رات ہے
یہ سوچنے کی بات ہے

آ اچھے ہمسائے بنیں
سکھ اور دکھ مل کر سہیں
طاقت کا جزو انصا ف ہے
جس کا جو حق ہے اس کو دیں
بغض و جلن کو چھوڑ دیں
مل بیٹھ کر باتیں کریں
امن واماں سوغات ہے
شبھ جس سے دن شبھ رات ہے
پر سوچنے کی بات ہے

نجمہ یاسمین یوسف

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

عالمی یوم خواتین کے موقع پر ایک خصوصی تحریر

منزل کتنی دور ہے .....؟؟؟

ویمن کونسل آف وکٹوریہ (سڈنی، آسٹریلیا) کی ایک ذیلی کمیٹی جو خواتین کے مسائل کو حل کرنے کی دعویدار بلکہ ذمہ دار ہے، اس دفعہ اس کی سالانہ میٹنگ میں دو خواتین اپنے مسائل لے کر آئیں۔ دونوں پاکستانی ہیں۔ دونوں پریشان ہیں۔ دونوں منزل کی تلاش میں ہیں۔ ہم کمیٹی ممبران نے ان کی کہانی سنی اور اس پر غور و فکر جاری ہے کہ ان کو کیا مشورہ دیا جائے۔ ان میں سے ایک کی کہانی آپ بھی پڑھیں اور سوچیں کہ عورت کا پر خطر سفر کب سے جاری ہے۔ اس کے مسائل، اس کی محرومیاں، اس کی ضرورتیں اور سب سے بڑی بات، اس کی منزل تلاش کرنے میں اس کی مدد کریں۔

یہ عذرا توفیق ہیں ان کی عمر ۲۸ سال ہے۔ انگلش میں ایم اے کر کے آئی ہیں۔ شادی سے پہلے لاہور کے ایک مشہور سکول میں پڑھاتی رہی ہیں۔ ان کی منگنی بچپن میں جبکہ ان کے کھیلنے کھانے کے دن تھے خالہ کے بیٹے سے ہوگئی جس سے یہ بے خبر تھیں کیونکہ پانچویں کلاس کی طالبہ کو کسی نے بتانا ضروری نہ سمجھا۔ عثمان اس کا منگیتر اس سے سات سال بڑا تھا۔ جب وہ میٹرک میں آئی تو ایک دن وہ گاڑی لے کر آیا اور کہنے لگا اجی چلو آئس کریم کھاتے ہیں۔ اسے ہاتھ سے پکڑ کر ساتھ لے گیا۔

اس نے اعتراض کیا کہ عثمان بھائی یہ کیا حرکت کی آپ نے؟

وہ جذباتی ہو کر بولا۔ تو کیا ہوا، ہاتھ ہی تو پکڑا ہے۔ میں تو اور بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں جس کا مجھے حق حاصل ہے۔

کیا مطلب؟ عذرا پریشان ہوگئی۔

بھئی تم میری منگیتر ہو بس ایف اے کر لو تو شادی ہو جائے گی۔

آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ مجھے اس منگنی کی خبر نہیں ہے میں امی سے پوچھوں گی۔ چلیں واپس چلیں، ابھی چلیں۔

اس کی امی نے بتایا ہاں میری بہن نے تمھارے پیدا ہوتے ہی تمھیں مانگ لیا تھا عثمان کے لیے۔

لیکن آپ نے یہ بات مجھے کیوں نہ بتائی اور عثمان بھائی کو بتا دی اس لیے کہ وہ مرد ہے اور میں لڑکی ہوں۔

وہ غصے سے کمرے میں گئی اور لاک اپ ہوگئی۔ سب نے بڑی منت کی۔ شام کو اس کے ابو تنویر صاحب نے بڑی مشکل سے دروازہ کھلوایا۔

اس نے ابو سے پوچھا کیا یہ منگنی سچ ہے؟

وہ بولے۔ تمھاری ماں اور خالہ کے درمیان صرف بات ہوئی تھی لیکن تمھاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔ میں تو اس بات کو بھول گیا تھا لیکن تمھاری امی کو اس بھانجے سے بہت پیار ہے کیونکہ انھوں نے اسے بچپن میں پالا ہے۔ پھر یہ ڈاکٹر بن

رہا ہے سفید اوور آل پہنے ہاتھ میں سٹیتھوسکوپ لیے ڈاکٹرز تمھاری ماں کو بہت پسند ہیں۔

لیکن ابو مجھے ڈاکٹرز ہر لگتے ہیں۔ سنگدل، چیر پھاڑ کرتے ہیں۔انھیں کسی کے جذبات کی پرواہی نہیں ہوتی۔

بیٹے! آپریشن وہ کسی کی جان بچانے کے لیے کرتے ہیں۔ یہ تو نیکی کا کام ہے۔بس مجھے نہیں پسند..... میں نے عثمان سے شادی نہیں کرنی۔

ابھی تم غصے میں ہواٹھومنہ ہاتھ دھولو، آؤ کھانا کھائیں۔ اس موضوع پر ہم پھر بات کریں گے۔

پہلے آپ مجھ سے وعدہ کریں، پھر میں آپ کی بات مانوں گی.....

اچھاوعدہ، چلو۔

اس وقت تو طوفان تھم گیا لیکن گھر میں سرد جنگ شروع ہوگئی۔ایک طرف باپ بیٹی، دوسری طرف ماں اور باقی بہن بھائی۔ جونہی عثمان ان کے گھر آتا عذرا کمرے میں بند ہو جاتی،اس کا تحفہ اس کے منہ پر مار دیتی۔امی کا رویہ بدل چکا تھا وہ اسے چلتے پھرتے جلی کٹی سناتیں۔تنویر صاحب بھی نشانہ بنتے۔ ماں کہتی کہ سب تنویر صاحب کا کیا دھرا ہے۔ بجائے سمجھانے کے اس کو سر پر بٹھا لیا ہے۔ میرے خاندان میں وہ رشتہ کرنا ہی نہیں چاہتے۔انھوں نے عذرا کو پٹی پڑھادی ہے۔ دو دفعہ انھوں نے دھمکی دی کہ تنویر! اگر آپ نے یہ منگنی توڑی تو میں میکے چلی جاؤں گی۔

اسی اثنا میں تنویر صاحب کے دوست آسٹریلیا سے آئے۔ان کے ساتھ ان کا بیٹا توفیق بھی تھا انھوں نے عذرا کو پسند کرلیا۔تنویر صاحب نے ہاں کر دی۔عذرا تو چاہتی ہی تھی کہ کسی طرح عثمان کے نام کا دم چھلا اترے۔اس کی امی نے اتنا فساد مچایا کہ تنویر صاحب ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر ہسپتال کے آئی سی یو میں چلے گئے۔ جب ذرا ہوش آیا تو انھوں نے اپنے بیٹوں اور بیوی کو بلایا اور بڑے بیٹے عاصم سے کہا کہ توفیق کو بلاؤ میں نے عذرا کا رشتہ اس سے طے کر دیا ہے۔ میری وصیت یاد رکھنا۔ میں زندہ نہ بھی رہوں تو یہ تمھارا فرض ہے۔ میں کسی بچے پر زبردستی کوئی فیصلہ نافذ نہیں کروں گا۔اسی رات تنویر صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔سب نے سر تسلیم خم کر دیا۔

تین ماہ بعد عذرا کی شادی ہوگئی اور وہ دلہن بن کر آسٹریلیا آ گئی۔ یہاں زندگی ایک نئے روپ میں جلوہ گر تھی۔ ایک کمرے کا یونٹ تھا جس میں صرف ایک میٹریس تھا اور ایک کمبل، چار برتن، ایک استری اور ایک کمپیوٹر۔گھر کے باہر ٹیکسی کھڑی تھی عذرا نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا۔تنویر صاحب بہت بڑے بزنس مین تھے گھر میں ہر طرح کا آرام، سہولت، بلکہ عیش میسر تھا عذرا کے پاس اپنی گاڑی تھی اور یہ بتایا گیا تھا کہ توفیق آئی ٹی انجینئر ہے۔تعلقات، پیسہ، رشتے آسانیاں میسر تھیں لیکن حالات ایسے کہ کسی نے بھی تحقیقات کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔مگر اب تو وقت گزر چکا تھا۔ وقت کی فلم کو الٹا تو نہیں چلایا جا سکتا۔

توفیق عجیب طرح کا انسان تھا۔ ہینڈسم، گورا رنگ، ذرا سا فربہی مائل، لیکن وہ ٹیکسی چلاتا تھا۔ جب عذرا نے گھر کے باہر ٹیکسی کھڑی دیکھی تو دھڑ دھڑ سارے محلات زمیں بوس ہو

گئے۔ آتے ہوئے بھائی نے ایک ہزار ڈالر دیے تھے وہ کھوئے کھوئے انداز میں شاپنگ سنٹر گئی اور ضرورت کی چیزیں خرید کر لائی۔ شدید سردی تھی اور ہیٹر نہیں تھا۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ ممی کا فون نہ آیا، نہ کسی بھائی کا۔ وہ رات بھر بے آواز روتی رہی۔ اندر زلزلے آتے رہے۔ ماضی، گھر، سکول، لاہور کی گلیاں، فوڈ سٹریٹ، اپنا کمرہ، اپنا وارڈ روب، اپنی گاڑی سب کچھ وہیں رہ گیا تھا۔ عثمان کا خیال آتے ہی اس کے منہ میں کڑواہٹ بھر گئی۔ یہ سب کچھ اسی منحوس کی وجہ سے ہوا ہے۔

اس نے توفیق سے کہا میری پاکستان بات کروا دیں۔ یہاں سے کال بہت مہنگی پڑتی ہے اس نے روکھا سا جواب دیا۔ پھر مجھے موبائل لے دیں اس نے درخواست کی۔ کل لے لینا۔ اس نے نمبر لیا سم ڈلوائی اور ممی سے بات کی۔ ان کا انداز روٹھا روٹھا تھا۔ ممی کی آواز سنتے ہی اس کا دل بھر آیا اور اس نے زاروقطار رونا شروع کر دیا جیسے ماں کی ساری باتیں سمجھ آ گئی ہوں۔ آنسو بہتے رہے۔ ممی نے کچھ نہ کہا بس نصیحت کرتی رہیں۔ نئے لوگوں میں ایڈجسٹ کرنے میں کچھ وقت لگ جاتا ہے۔ بات بات پر رونا بزدلی ہے، صبر کرنا سیکھو، عورت کا دوسرا نام ہی صبر ہے۔ اب تو تمھاری اپنی مرضی اور پسند سے شادی ہوئی ہے تمھیں تو ہواؤں میں اڑنا چاہیے۔ اب توفیق کی شکایتیں لے کر نہ بیٹھ جانا، میاں بیوی کا رشتہ لیلیٰ مجنوں کا رشتہ نہیں ہوتا، نہ اس میں رومانس کا کوئی ذکر ہے، اب خیالی دنیا سے نکل کر دنیا کا اصل روپ دیکھو۔ یہ کہہ کر فون کھٹ سے بند ہو گیا۔

اسے لگا کہ وہ بے پر کا چڑیا کا ایسا بچہ ہے جسے وقت کی چیل صحرا میں چھوڑ گئی ہو۔ ایک پوٹ جس نے ابھی اڑنا نہیں سیکھا۔ صحرا، ریگستان، ریت، پیاس، گرمی، سناٹا، تنہائی، تیز گرم لو، آندھی، یہ منزل ہے؟ اس کا نام شادی ہے؟ یہ بندھن ہے؟ خوشی کہاں ہے۔ اس صحرا میں یہ دفینہ کہاں تلاش کروں۔ توفیق کی تربیت میں بڑی خامیاں تھیں۔ وقت کی پابندی فضول آئیڈیا تھا۔ وعدہ پورا کرنا فطرت کے خلاف۔ بھوک ناقابل برداشت۔ زبان پر کانٹے۔ میٹھا لفظ، نرم بول، حوصلہ افزائی، محبت کا اظہار، الفاظ کا زیاں تھا۔ دوسرے کو زرخرید غلام سمجھنا اس کا حق ٹھہرا۔ اسے ایک گیت کے بول یاد آتے۔ کسے آواز دوں آواز دوں۔ کوئی نہیں ہے۔ ابو آپ کہاں ہیں لیکن اس نے سوچا۔ گھر والے تجھے رخصت کر کے مطمئن ہو گئے ہیں، بوجھ اتر گیا ہے۔ اب برداشت کرو۔ میں سمجھوتے کی چادر بن رہی ہوں۔ اک اک تار میں آنسو پروتی ہوں۔ میرے جذبوں کے سارے رنگ۔ نمایاں ہے مگر ایثار کا ہی رنگ۔ اسی رنگ سے چھڑ جاتی ہے جنگ۔ مجھے اک اجنبی کے سنگ چلنا ہے۔ مجھے اب عمر بھر سورج میں جلنا ہے۔ کوئی سایہ کوئی خوشبو میری ترسی ہوئی نظریں جا کر لوٹ آتی ہیں۔ بناتی ہیں وہ سمجھوتے کی چادر۔ اسی سے اپنا تن ڈھانپو۔ اسی سے پونچھ لو آنسو۔ چلو آگے۔

پھر نئے مہمان کی آمد کا اعلان۔ کھانے کو جی نہ چاہتا۔ دل متلاتا رہتا۔ بیٹی نے آنکھ کھولی تو اس کی آنکھ سے دو آنسو ٹپکے۔ جب بچی کے گالوں پر گرے تو اس نے پریشان ہو کر آنکھیں کھول دیں۔ اس دنیا میں کیا لینے آئی ہو۔ تیری ماں کا

دامن تو خوشیوں سے خالی ہے۔ میری ننھی پری میں تجھے کیا دوں گی۔اب توفیق کی ضد اور اصرار۔نوکری ڈھونڈو، میں تم کو بٹھا کر نہیں کھلا سکتا۔ بچی کو گلے میں لٹکا کر (بیگ میں) وہ ملازمت کی تلاش میں نکل گئی ایک دکان پر سیلز گرل کی جاب ملی۔ چھ ماہ کی بچی کو ڈے کیئر میں ڈالا اور کام میں جت گئی۔ دن رات کے چکر میں تین سال گزر گئے۔ نہ کمرے کی فضا بدلی نہ شوہر کی ہوا بدلی، نہ کوئی ملنے آیا، نہ میکہ نہ سسرال نہ دوست نہ آشنا۔

ممی نے بتایا عثمان کی شادی اس کی تایا زاد مونا سے ہوگئی ہے اس کو کنگ فہد نے اپنے ذاتی معالج کی حیثیت سے جاب دے دی ایک محل جیسا گھر، ذاتی جہاز.....گاڑی، اعلیٰ تنخواہ اور بے شمار سہولتیں اس نے مجھے سب سے پہلے عمرے کے لیے بلایا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔لیکن ممی آپ یہ سب کچھ مجھے کیوں سنا رہی ہیں۔عذرا کا لہجہ شکستہ تھا۔کبھی کبھی انسان ہیرا چھوڑ کر کوئلہ اٹھالیتا ہے جس سے منہ ہاتھ کالے ہو جاتے ہیں۔وہ اندر سے کرچی کرچی ہوگئی۔اس نے فون بند کر دیا۔ جب بھی فون کرتی .....عثمان کی کوئی نہ کوئی تعریف ممی کی زبان پر ہوتی۔ انھوں نے کبھی یہ نہ پوچھا کہ میری اجو کیسی ہے۔ڈلیوری کے وقت سب کی مائیں آتی ہیں لیکن ممی نے کہا کہ میں فارغ نہیں ہوں وہاں کے ہسپتال بہت اچھے ہیں۔

اس نے اسی پتھر کے ساتھ سر پھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ توفیق سے کہا کہ داخلہ لے کر اپنی پڑھائی مکمل کرے۔اس نے پاکستان میں اپنے حصے کی جائیداد بیچ کر سارے پیسے منگوا لیے اور اسے دے دیئے کہ چھوٹا سا گھر لے لو۔اس نے کہا بڑا خوبصورت اور عالی شان گھر تو میرا خواب ہے چھوٹا کیوں لوں۔اس نے پلاٹ لیا۔ بنک سے قرضہ لیا اور شاندار گھر بنوایا۔اب دو دو نوکریاں تھیں کیونکہ قرض اتارنا تھا۔تین ہزار ڈالر ہر ماہ قسط ادا کرنی ہوتی۔جس میں آدھا قرضہ آدھا سود ہوتا۔گھر کو فرنش کیا۔اعلیٰ بستر،صوفے،فرنیچر، برتن وہ سسکتی رہی توفیق یہ قرضہ اترنے دو میں تو زمین پر سو جاؤں گی ایک کمبل کافی ہے لیکن اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔جب اس نے کہا نادان عورت.....کماتا میں ہوں تمھیں سود دینے کی تکلیف کیوں ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سود حرام ہے۔ بڑی مولوی کی بچی بنی پھرتی ہو علماء نے کہا ہے کہ ایک گھر کے لیے قرضہ لینا جائز ہے اگر تم سے برداشت نہیں ہوتا تو جاؤ اپنی بچی کو لے کر دفع ہو جاؤ۔ میں طلاق بھجوا دوں گا۔میرا خرچ کم ہو جائے گا اور قرضہ جلدی اتر جائے گا۔

اس نے اچھی جاب تلاش کی اور گھر کا سارا بوجھ اور خرچ اٹھا لیا۔لیکن اب توفیق قسط دینے کے بعد دوستوں کی دعوتوں میں باقی ڈالر اڑا دیتا۔ آج باربی کیو ہے۔ اگلے ہفتے گولڈ کوسٹ جانا ہے۔اس کے پراٹھے اور کڑھی پکے گی۔دوستوں مفت خوروں کا ایک جم غفیر عیش اڑائے گا۔وہ جاب سے پانچ دن کام کر کے تھک جاتی۔ ویک اینڈ پر بریانی، دہی بھلے، حلوہ، پراٹھے، پلاؤ، کباب نہ جانے کیا کیا.....یوں لگتا تھا صدیوں کی بھوک ہے جانے ہمارا پیٹ بھوکا ہے یا نیت.....یا دونوں۔ وہ لڑ لڑ کر چپ ہوگئی۔اس نے ہتھیار ڈال دیے۔خاموشی میں پناہ لے لی۔اب اس کا نیا مطالبہ تھا۔ بچی پانچ سال کی ہوگئی ہے ایک بیٹا ہونا چاہیے۔حمل ٹھہر گیا لیکن جب تک الٹرا ساؤنڈ

سے تصدیق نہیں ہوگئی کہ بیٹا ہے اس کی جان عذاب میں رہی۔صبح بیٹا.....شام بیٹا ہر خواہش کا نام بیٹا۔اس نے کہا یہ اللہ کے اختیار میں ہے۔اسی سے دعا مانگو انسان کی مرضی کو اس میں کیا دخل ہے۔ یہ تو اس کی نعمت ہے۔ جسے چاہے عطا کر دے۔ نہ دے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بند کرو اپنا لیکچر..... جواب ملتا۔

اس نے امتحان پاس کرلیا۔اچھی جاب مل گئی۔وہ آہستہ آہستہ کہہ دیتی صبح کی نماز ضرور پڑھ لیا کریں۔تم جو ایک پڑھ لیتی ہو کافی نہیں ہے۔ میری ماں بننے کی کوشش نہ کرو۔ میری ماں کو تو اپنے فیشن سے ہی فرصت نہ تھی وہ مجھے کیا نصیحت کرتی اور تم تو پیدائشی فقیرنی ہو۔کبھی اپنا حلیہ دیکھا ہے۔ شام کو گھر آنے کو جی نہیں چاہتا کہ تمھارے سڑے بسے کپڑے اور رونی شکل نظر آئے گی۔اب اس نے اپنے حلیے پر دھیان دیا۔ چند جوڑے خریدے۔میک اپ کا سامان لائی، بال سیٹ کرائے۔ وہ تو سب کچھ بھول گئی تھی۔اسے تو یوں لگتا تھا کہ وہ کنیز ابن کنیز ہے ہمیشہ سے غلامی کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ وہ کھانا کھاتا تو کبھی اسے یہ نہ کہا کہ آؤ تم بھی میرے ساتھ کھا لو۔گرم پھلکا لاؤ.....اس کو پکی پکائی روٹی پسند نہ تھی۔ٹھنڈا پانی لاؤ.....اچار نہیں رکھا۔آج سلاد کیسے کاٹا ہے۔ کباب کہاں ہیں کب لاؤ گی؟ جب کھانا ختم ہو جائے گا تب لاؤ گی۔ میٹھے میں آج کیا ہے.....گاجر کا حلوہ..... یا کھیر تمھیں تو کھانا پکانا بھی نہیں آتا۔ پر کیا کروں اب میرے پلے پڑ گئی ہو تو گزارہ تو کرنا پڑے گا۔کھانا کھانے کے بعد یہ تعریفی کلمات سن کر اس کی بھوک اڑ جاتی۔بس چلتے پھرتے کبھی چائے پی لی۔ ڈبل روٹی کا ایک سوکھا سلائس لے لیا۔یا فاقہ ہی سہی۔رات کو تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا۔ننھی زینب پوچھتی ماما تم رو رہی ہو۔ درد ہو رہا ہے کہاں چوٹ لگی ہے.....؟نہیں میرے چندا کچھ نہیں..... پھر اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ کرنے غفران آ گیا۔ پتہ نہیں کیسی قسمت تھی اس کی!اس کی نیند ایسی تھی کہ پانچ منٹ سے زیادہ سو نہ پاتا۔توفیق کا حکم تھا کہ بچہ الگ کمرے میں اپنے جھولے میں سوئے گا۔وہ ہر پانچ منٹ کے بعد آتی اس کو تھپکی دیتی پھر واپس جاتی۔اسی آنے جانے میں صبح ہو جاتی۔ چند دنوں میں عذرا کو بخار آنے لگا۔وزن کم ہو گیا۔آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔آخر وہ تھک کر گر گئی۔ہسپتال گئی تو پتہ چلا کہ انفیکشن بھی ہے اور جاگنے اور تھکن سے نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے۔تین دن بعد اسے ہوش آیا۔

پھر وہی گھر، وہی بچے۔ وہی روٹین اور وہی بے حس انسان۔ بھائی کی شادی تھی ممی نے بلایا، جواب ملا میرے پاس ٹکٹ کے پیسے نہیں ہیں تمھارے ایک درجن بہن بھائیوں کی شادیوں پر جانا میں افورڈ نہیں کر سکتا۔ چار بھائی امریکہ جا بسے۔دو سوئٹزرلینڈ چلے گئے ممی اکیلی رہ گئیں۔عذرا بلاتی رہ گئی لیکن ممی نے نہ آنا تھا نہ وہ آئیں۔غفران دو سال کا ہوا تو پھر توفیق کا پریشر تھا۔ جاب ڈھونڈو، جاب کر لو، گھر میں فالتو روٹیاں توڑتی ہو۔ میں ایک اکیلا کیا کیا کروں۔ پیسہ پیسہ اور پھر پیسہ۔یا الٰہی ہم انسان ہیں یا خواہشات کے پلندے!

عذرا پوچھتی ہے۔عورت کا مقام کیا ہے اس کا گھر کون سا ہے؟ کیا وہ اپنے بارے میں فیصلے کرنے کی مجاز نہیں ہے؟ اگر ہے تو کس حد تک؟ باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے کی فرمانبرداری

لازم ہے؟ کیا عورت انسان ہے بھی؟ یا اللہ تعالیٰ نے اسے انسان ہی پیدا کیا تھا لیکن مرد نے اسے انسان تسلیم نہیں کیا۔ اللہ پاک نے سچی کتاب میں فرمایا ..... کہ عورتوں سے اچھا سلوک کرو۔ جو بھی نیک عمل کرے گا مرد ہو یا عورت مگر ہو وہ مومن تو اللہ ان کے اعمال کا پورا پورا اجر انھیں عطا فرمائے گا۔ اپنے والدین کی عزت کرو، ان کی خدمت کرو۔ ان کے آگے اف نہ کرو۔ تمھاری ماں نے ضعف پہ ضعف اٹھا کر تکلیف سے تمھیں پیٹ میں رکھا اور تکلیف سے ہی تمھیں جنم دیا۔ پھر تیس ماہ تمھارا دودھ چھڑانے میں لگ گئے۔ اس نے تکلیف اٹھا کر تمھیں پالا۔ اگر ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر تمھارے پاس آ جائیں تو ان کو اف تک نہ کہو۔ تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے بیویاں پیدا کیں جن کے پاس تم سکون حاصل کرتے ہو۔ جو عورتیں تمھیں پسند آئیں ان میں سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کر لو اگر تمھیں خطرہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکتے تو ایک ہی ٹھیک ہے۔ اگر تم بیوی کو طلاق دو تو اسے جو کچھ دے چکے ہو۔ واپس نہ لو۔ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں بہت پسند ہو لیکن وہ تمھارے لیے بہتر نہ ہو اور ایک چیز تمھیں پسند نہ ہو لیکن تمھارے لیے اچھی ہو تم نہیں جانتے لیکن اللہ جانتا ہے۔ جس خدا نے غلاموں تک کے لیے یہ حکم دیا ہے کہ جو خود کھاؤ انھیں کھلاؤ۔ جو خود پہنو انھیں پہناؤ۔ ان کی استطاعت سے زیادہ کام کا بوجھ ان پر نہ ڈالو۔ اگر وہ آزاد ہونا چاہیں تو ان سے لکھت پڑھت کر لیں۔

آسٹریلیا میں ازدواجی زندگی بہتر بنانے کے لیے ایک کمیٹی بنی ہوئی ہے۔ عذرا نے اپنا کیس ان کے ہاں پیش کیا جہاں اس کے شوہر کو بھی بلایا گیا۔

وہاں انھوں نے ایک ریفریشر کورس کا اجرا کیا ہوا ہے جس میں شادی شدہ جوڑے ہفتے میں دو لیکچر اٹینڈ کریں گے۔ ایک ڈاکٹر، ایک سائیکالوجسٹ، ایک کونسلر، ایک میرج سپیشلسٹ، ایک فیملی لا ایکسپرٹ نے مل کر لیکچر تیار کیے جس کا خلاصہ یہ ہے۔ مرد اور عورت کی حیثیت ..... وہ گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ نان نفقہ، علاج، گھر ضرورتیں پوری کرنا مرد کا فرض ہے احسان نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی عزت کریں۔ ایک دوسرے کو وقت اور توجہ دیں۔ تحفہ دیں۔ سیر و تفریح بھی لازم ہے۔ عورت پر ملازمت کرنا اور گھر کے اخراجات میں حصہ ڈالنا لازم نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ فارغ ہو، شوق سے کام کرنا چاہے تو پابندی نہ ہو۔ لیکن اس کے پیسے پر شوہر کا حق نہیں ہے وہ جہاں چاہے اسے استعمال کر سکتی ہے۔ تجارت میں لگا سکتی ہے۔ اپنے رشتے داروں کی مدد کر سکتی ہے۔ صلہ رحمی کر سکتی ہے۔ صدقہ کر سکتی ہے۔ طعنہ، طنز، جھگڑا لڑائی یعنی ذہنی، نفسیاتی، جسمانی تشدد ممنوع ہے۔ سال میں ایک دفعہ سیر و تفریح کے لیے جانا لازمی ہے۔ جب یہ طے پا گیا تو ہر دو ہفتے بعد میاں بیوی آ کر کونسل میں لیڈی کونسلر سے ملاقات کریں گے اور اپنے تعلقات کے بارے میں تبادلہ خیال کریں گے کہ حالات پہلے سے بہتر ہیں یا بالکل ویسے ہی ہیں۔ جن کی رپورٹ بہترین ہوگی انھیں کونسل کی طرف سے انعام دیا جائے گا۔ باقی لوگوں کی تعلیم و تربیت جاری رہے گی۔ یہاں سسرال (ساس، نند، دیور، بھابی، سسر، جٹھانی وغیرہ) کا کوئی جھگڑا ہی نہیں ہے کیونکہ آسٹریلین معاشرے میں بوڑھوں کے لیے اولڈ ہوم

بنے ہوئے ہیں۔ جہاں کرسمس پر ایک کارڈ بھیج کر اولاد فارغ ہو جاتی ہے۔ بچے اپنی مرضی سے شادی کر کے اپنی دنیا بسا لیتے ہیں۔

آپ بھی عذرا کے سوالوں کے جواب دیں۔ انتظار رہے گا۔

❁❁❁

غزل

پس دستور لکھا جا رہا ہے
نیا منشور لکھا جا رہا ہے
غم و اندوہ میں ڈوبی ہے دنیا
مگر مسرور لکھا جا رہا ہے
رگِ جاں سے مرے نزدیک ہیں جو
انہی کو دور لکھا جا رہا ہے
بنام بے گھری جو گھر نہیں ہیں
انہیں مفرور لکھا جا رہا ہے
سراپا تیرگی ہی تیرگی ہے
وہ جس کو نور لکھا جا رہا ہے
وہی تو پھول ہیں میرے چمن کے
جنھیں ناسور لکھا جا رہا ہے
ادب جس کو کوئی پڑھتا نہیں ہے
بہت بھرپور لکھا جا رہا ہے
جو مالک ہے ہنر کا اپنے طارقؔ
اسے مزدور لکھا جا رہا ہے

طارق محمود طارق-دمام

حمیرا خالد

کل اور آج

اللہ نصیب اچھے کرے.....وہ سوچتی کہ کتنی فکرمندی ہے اس دعا میں..... جہاں کسی لڑکی کی دنیا میں آمد کی خبر ملی اور ماتھے پر سوچ کی شکنیں ابھریں.....عورت کا نصیب شوہر ہی تو ہوتا ہے اور مرد کا نصیب بیوی.....اسی کا نام مقدر ہے۔خوش نصیب تو وہ ہے جس کو قدر دان خاندان مل گیا ورنہ.....

یہ جملے نادرہ کم عمری سے ہی سن رہی تھی..... بے حد کم گو اور حساس طبیعت تھی۔اپنے بارے میں گھر والوں کی فکرمندی اسے ذرا بھی اچھی نہ لگتی۔چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کی وجہ سے والدین شاید زیادہ ہی فکرمند تھے۔جب سے نادرہ کا رشتہ طے ہوا تھا وہ دیکھ رہی تھی کہ گھر والے خوش تو کم اور پریشان حال زیادہ ہیں۔جس کو دیکھو آہیں بھر بھر کے دعائیں دے رہا ہے۔بظاہر رشتہ میں کوئی خرابی بھی نہ تھی۔پڑھا لکھا خوش شکل لڑکا ماں باپ کا اکلوتا اور برسرروزگار شریف گھرانہ تھا۔لیکن اندیشے تھے کہ سب کو ڈسے جاتے تھے۔

آخر گاہے گاہے گھر کے بزرگوں نے اپنے اپنے تجربات کی روشنی میں نادرہ کو گھر بسانے کے گر سکھانے شروع کیے۔پھپھو نے تو آنے والے خطرات سے پہلے ہی ذہنی طور پر تیار کرنے کو ضروری سمجھا۔ایسا نہ ہو کہ بچی کے خواب چکنا چور ہوئے تو دل برداشتہ ہو کر کوئی غلط قدم اٹھا لے۔انہوں نے سسرالی رشتوں کی اونچ نیچ سے آگاہ کرنا فرض جانا۔اور جب بھی موقع ملتا وہ نادرہ کا سر اپنی گود میں رکھ کر پیار سے سہلاتی جاتیں اور رشتوں کی حقیقت سمجھاتی رہتیں۔دیکھو بیٹا تم اپنے نئے گھر میں جانے والی ہو، یہاں ماں کے روپ میں ساس ملے گی۔اللہ کرے وہ ماں ہی ثابت ہو۔لیکن پھر بھی بیٹا یہ توقع نہ رکھنا، ساس کو ساس ہی سمجھنا۔مطلب یہ ہے کہ بہت نازک رشتہ ہوتا ہے بہت خیال رکھنا ہوگا۔ماں کے ساتھ والا بے ڈھنگا پن نہیں چلے گا۔وہاں تو پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوں گے۔کبھی بڑی آپا سانس بھرتیں، اکلوتی بہو ہوگی گھر میں کوئی ہاتھ بٹانے والا بھی تو نہیں۔سارے گھر کی ذمہ داری آن پڑے کوئی آسان کام ہے۔خالہ امی کا کہنا تھا کہ سنا ہے ساس اماں شروع سے ہی بہت رکھ رکھاؤ والی ہیں۔اولاد تو کوئی اور ہوئی نہ..... بھائی پہ بڑا مان تھا۔بھائی کی شادی اس لیے نہ چل سکی۔بہنوں کی دخل اندازی بھاوج کہاں تک برداشت کرتی۔چار دن میں تیا پانچہ ہو گیا۔اللہ آگے خیر کرے.....گھر میں لانے والی کا گھر بسانے کیلئے بہت کچھ حوالے کرنا ہوتا ہے۔

شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔نادرہ کے ذہن میں آنے والے دنوں کے بارے میں کوئی خوشگوار تصور نہیں تھا۔

اسے تو تمام نصیحتیں یاد دلاتی رہتیں کہ ایک محاذ ہے جہاں وہ تعینات کی جارہی ہے یا کوئی دشوار گزار گھاٹی ہے جہاں سے اسے گزرنا ہے۔اس نے جان لیا تھا کہ زندگی بھر کی مشقت ہے جو وہ مول لینے جارہی ہے۔لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں کہ لڑکیاں اپنے گھر ہی اچھی..... مستقبل سے کسی خیر کی توقع کیا رکھتی بس اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ اکلوتی بہو بن کر جانے والی آگے اور پیچھے سب کی توقعات پر کیسے اترے گی۔

سسرال سے ہر دن کوئی نہ کوئی رشتہ دار ملنے کے بہانہ چلا آرہا ہوتا کہ آنے والی بہو کے دیدار ہو جائیں۔کچھ قبل از وقت جانچ پرکھ ہو جائے کہ پوت کے پاؤں تو پالنے میں ہی دکھائی دے جاتے ہیں۔ہر آنے والا مہمان نادرہ کو ایک کشمکش میں ڈال جاتا..... بہت خیال رکھنا بچے.....اس گھر کی تم ہی تو مالک ہو.....اکلوتے بیٹے کی دلہن سے ہی تو سارے ارمان ہوتے ہیں۔ساس ماں کی محرومیاں دور کرنا اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔

ڈھیر ساری باتیں نادرہ کے ذہن میں گھومتی رہتیں ان کے درمیان صرف ایک شخصیت کا خاکہ اس پر چھایا ہوا تھا۔وہ ساس ماں، جن کا تذکرہ سب سے زیادہ تھا.....نجانے وہ مجھ سے کیا امیدیں لگائے ہوں گی.....ان کی بچپن کی دوست نے بڑی حسرت سے کہا تھا۔بیٹی میری دوست کو بہت خوش رکھنا زندگی میں بڑی ناگواریاں برداشت کی ہیں اس نے..... یوں سمجھو اپنی پسند اور مزاج کے خلاف سمجھوتے ہی سمجھوتے کیے ہیں۔اب آخر عمر کی خوشیاں تم سے وابستہ ہیں۔

نادرہ ایک فرمانبردار بیٹی کی طرح سارے تبصرے اپنی گرہ میں باندھ لیتی اور آنے والے کٹھن وقت سے نمٹنے کیلئے رب کے حضور سجدہ ریز ہو جاتی۔یوں دیکھتے ہی دیکھتے فاصلے سمٹتے گئے تقریب ولیمہ اپنے عروج پر تھی۔سسرالی عزیزوں اور احباب کے درمیان اس کا پہلا دن تھا..... جہاں خاموش خوبصورت مورتی کی طرح اپنے بارے میں صرف قسم قسم کے تبصرے سن سکتی تھی۔

تحسین بھی اور پیشین گوئیاں اس کے بارے میں بڑے ماہرانہ انداز سے پیش کی جارہی تھیں۔البتہ ساس اماں بڑے فخریہ انداز میں سب پر واضح کر رہی تھیں کہ دیکھا میرا انتخاب.....

اس لمحے انہیں بہو کی صرف صورت کی نمائش سے دلچسپی تھی۔ان کی اس کامیابی پر کتنے لوگ حقیقتاً رشک کر رہے تھے تو کتنی حاسدانہ نگاہیں کسی حادثہ کی منتظر تھیں۔

ابتدا میں ہی نادرہ کو اپنی ساس اماں کی حسن پرست شخصیت کا اندازہ ہو گیا تھا ہر دن ان کی نگاہیں اس کے چہرے کے میک اپ لباس اور ہیئر سٹائل کا ناقدانہ جائزہ لیتیں اور پھر بلا تکلف اپنے زاویے سے کسی کمی کا برملا اعلان بھی کر دیا کرتیں یہ سوچے بغیر کہ وہ کیا سبکی محسوس کرتی ہو گی۔

نادرہ اب ان بے باک تبصروں سے بچنے کیلئے کچھ پرے پرے رہنے لگی یوں ان کے درمیان ایک جھجک آ گئی جس سے اجنبیت دور ہونے کی بجائے بڑھتی گئی۔

م..... میکہ اور س.....سسرال ایسے عنوان ہیں جو ہر بیاہی عورت کے ساتھ آخر دم تک رہتے ہیں۔نادرہ نے مختصر سے وقت میں خوب سمجھ لیا کہ ساس اماں ان کشتیوں میں سوار

ہیں لیکن ایک مشاق کشتی بان ہونے کے باوجود زخم کھا ہی جاتی ہیں۔ سسرالی رشتوں میں اگر چہ وہ اتنی پسندیدہ تو نہیں تھیں لیکن میکہ کے احسانات کی وجہ سے شوہر اور نندوں پر رعب ان کا ہی تھا کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کی رائے اور فیصلہ کو رد کر سکے لیکن اندر سے اسی ٹوہ میں رہتے کب کچھ غلط ہو تو شکست خوردہ جذبوں کو تسکین ملے۔

ایسے میں نادرہ کو اپنی ساس اماں سے بے حد ہمدردی ہوتی وہ انہیں کسی طور بھی ناکام نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ان عزت میں اسے اپنی چھاؤں نظر آتی۔ اسی لیے وہ ان کا ہر کام اور حکم کی بجا آوری پوری احتیاط اور محنت سے کرتی چاہے اس میں اسے خود کتنی ہی دشواری کیوں نہ ہو لیکن ساس اماں کا مان رہ جائے۔ کتنی ہلکان ہوگئی تھی جب ساس اماں نے ایک موقع پر تنہا اس پر کتنا کام ڈال دیا تھا۔ مہمانوں کی تواضع کیلئے ساس اماں کی فرمائش پر کوفتے پلاؤ اور میٹھا دسترخوان پر سجا کر اب نڈھال ہو چکی تھی۔ کھانے والوں کے مزے لے لے کر تعریفی جملے ساس اماں کو عزت بخش رہے تھے۔ اسے اپنی تھکاوٹ کی یہ قیمت ذرا اچھی نہ لگ رہی تھی۔ کہ ساس امی اس کی کیفیت کو بھانپ گئیں۔ فوراً احساس دلایا کہ کسی کو محنت کے بعد تحسین مل جائے تو وہ تھکن اتارنے کیلئے کافی ہے۔ ورنہ کتنوں کے نصیب میں تو یہ بھی نہیں..... دل نے اس منطق کو ذرا بھی قبول نہ کیا۔ وہ خاموش ہی رہی۔

ساس امی ایک ممتحن کی طرح اس کے شب و روز کی چلت پھرت کو نظروں میں رکھتیں اگر چہ مداخلت بالکل نہ کرتیں لیکن جہاں اونچ نیچ دکھائی دیتی جوان کے خاکے سے باہر ہوتی تو صاف گوئی سے کام لینے سے بھی نہ چوکتیں۔

اس گھٹے گھٹے ماحول میں آخر نادرہ نے اپنے لیے راہ نکالنے کی نت نئی تدبیریں کرنی شروع کیں جس سے ساس اماں کے معاملات بھی متاثر نہ ہوں اور وہ اپنی مرضی سے جی سکے۔

زندگی کچھ اس ڈھب پر چل نکلی تھی کہ ساس بہو میں نہ کبھی کوئی ٹکراؤ ہوا نہ رنجش، نہ تلخ کلامی..... رواں پانی کی طرح جو رکاوٹوں میں بھی اپنا راستہ نکال ہی لیا کرتا ہے۔ رکاوٹوں کو ہٹائے بغیر.....وقت کے اوراق الٹتے گئے.....

کل جو جوان تھے اب بڑھاپے کی سرحدیں پار کر رہے تھے تو بچے اپنے والدین کے رنگ و روپ میں ان کی گدی سنبھالے ہوئے تھے۔ نادرہ کو اپنی بہو رخشی کی صورت میں اپنی جوانی یاد آ رہی تھی۔ یوں ہر دم جواں رہنے کا قدرت کا یہ انداز بھی کتنا بھلا تھا۔ سبز رنگ اس پر کتنا جچتا تھا۔ بہو کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کا جی چاہا کہ وہی تصویر دل میں اتر آئے۔ وہی سجاوٹ تازگی کا احساس پانے کیلئے فرمائش لبوں پر آیا ہی چاہتی تھی کہ جیسے اندر سے کسی نے یاد دلایا۔ خبردار ایسا نہ ہو کہ بہو اپنی مرضی سے کچھ زیب تن کرنا چاہے.....اور تیری اتنی سی بات سے پرے پرے ہوگئی تو کیا ہوگا.....نہیں مجھے اپنی پسند کا اظہار نہیں کرنا چاہیے اس نے اپنے آپ کو روک لیا۔ وہ اسی سوچ میں تھی کہ رخشی سبز اور فیروزی کپڑے ہاتھ میں لیے پوچھ رہی تھی.....مما بتائیں ناں آج کون سے کلر کے کپڑے پہنوں میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔ پہلے بھی امی ہی فیصلہ کرتیں اور مشکل آسان ہو جاتی.....اس کا دل باغ باغ ہوگیا۔

نادرہ نے کبھی بھی نہ چاہا کہ بہو کی آزادی اور پسند میں دخل اندازی کرے.....عمر کے یہی تو چند سال ہوتے ہیں جب بچیاں انجانے کون کون سے خواب بن رہی ہوتی ہیں۔ان کی زندگی کا مزہ کیوں چھینا جائے۔ بیٹے بہو اپنے گھر میں سکھی رہیں۔آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے مگر اس دفعہ تو رخشی اپنے ساتھ لے جانے پر ایسی بضد ہوئی کہ کوئی بہانہ کام نہ آیا۔

کتنے شوق سے وہ کہتی مما آپ میرے ساتھ ہوں گی تو مجھے کتنا اچھا لگے گا.....گھر بھی اکیلا نہ لگے گا اور گھومنے کا بھی مزہ آئے گا.....

اور پھر واقعی کتنے خوبصورت دن تھے۔جیسے گزرا وقت پھر لوٹ آیا ہو۔کبھی گھر کی سجاوٹ کی چیزیں آ رہی ہیں تو کبھی بچوں کی فرمائشیں پوری ہو رہی ہیں۔فرحان تو خود بچہ بنا ہوا تھا۔ ہر کام مما کریں، آلو کے پراٹھے تو سوجی کا حلوہ.....مما رخشی کو بھی سکھا دیں۔فرحان چٹخارے لیتے ہوئے مما سے لپٹ جاتا۔نادرہ انجانے خوف سے چونک اٹھتی کہیں بہو نے تو نہیں سن لیا.....کہیں سبکی نہ محسوس کر لے۔

ٹیلیفون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ بادل نخواستہ نادرہ نے اٹھایا، دوسری جانب رخشی کی دوست تھی جو یہ جانے بغیر کہ وہ رخشی نہیں ہے پرجوش انداز میں بول رہی تھی۔ رخشی ڈیئر..... یہ تمہاری ساس اماں کب رخصت ہوں گی۔ یار انہوں نے تو ڈیرے ہی ڈال لیے۔کب تک خاطر مدارت میں لگی رہو گی.....نادرا نے گھبرا کر ریسیور رکھتے ہوئے رخشی کو بلانا چاہا لیکن آواز حلق میں ہی رہ گئی.....اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے.....وہ ساس ہے.....زمانے کی نگاہوں میں ایک ناپسندیدہ رشتہ.....قدرت نے تو اسے ماں بنایا تھا۔اس کو عظمت دی تھی.....

مگر وہ ساس ہی رہے گی.....ساس.....!

☆☆☆

افشاں نوید

آخری چھ ماہ .....

یہی کوئی عصر کا وقت تھا۔تعزیت سے واپسی پر گاڑی راستے میں بند ہوگئی کینٹ کا علاقہ، رکشہ ٹیکسی کا حصول بھی ناممکن۔ بھائی کوفون کیا، بولے میرا دوست آ رہا آپ کوڈراپ کر دے گا۔ ذرا ہی دیر میں ایک گاڑی قریب آ کر رکی۔ میں اپنے شوہر اور بہن کے ہمراہ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ کچھ راستہ گزرنے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے نوجوان نے گاڑی سے اتر کر ہماری طرف دیکھ کر خداحافظ کہااور قریب ہی کھڑی بس میں سوار ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ہم بھی گھر پہنچ گئے۔

گھر آ کر یہ بولے ''آپ نے نوجوان کو دیکھا تھا جو جاتے ہوئے خداحافظ کہہ کر گیا تھا۔''

میں نے کہا ''جی ہاں ایک نظر دیکھا تھا کوئی تیس برس کے لگ بھگ کا نوجوان تھا۔''

بولے ''آپ نے ان دونوں کی گفتگو سنی؟''

میں نے کہا ''نہیں، بالکل نہیں میں تو عرصے بعد بہن سے ملی تھی بہت باتیں اکٹھی تھیں بس اپنی ہی باتیں کرتے رہے کیوں کیا ہوا؟''

میرے استفسار پر گہری سنجیدگی سے بولے ''وہ نوجوان کینسر کے آخری اسٹیج کا مریض ہے۔ غالباً دونوں دوست تھے مسلسل باتیں کر رہے تھے۔ وہ بتا رہا تھا کہ ڈاکٹر نے چھ ماہ کا وقت دیا ہے بس۔اس کا بھائی امریکہ بلانا چاہتا ہے لیکن اس کی خواہش ہے کہ آخری وقت اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ اپنی سرزمین پر گزارے اور یہیں اس کا مدفن ہو۔شاید اس کی ایک ہی بیٹی ہے۔ روما کا وہ بار بار نام لے رہا تھا جو مونٹیسری میں پڑھتی ہے۔''

میرے شوہر بہت دکھ سے بتا رہے تھے وہ گفتگو جو انھوں نے آدھا گھنٹہ سفر کے درمیان سنی اور جس کو سن کر میرے اندر بھی درد کی ایک لہر اتر گئی۔ چھ ماہ .....بس چھ ماہ .....بس ۲۴ ہفتے یا ۱۸۰ دن! کبھی کبھی اچانک مجھے ''۶'' کا ہندسہ دائروں کی شکل میں نظروں کے سامنے بنتا بگڑتا سا دکھائی دیتا۔کبھی ذہن گہری فکر میں ڈوب جاتا کہ اگر یہ چھ ماہ میرے پاس ہوتے تو چھ ماہ کے اس چھاگل کا قطرہ قطرہ کیسے جانِ حیات بناتی!! لیکن مجھے تو کسی نے چھ ماہ کی بھی یقین دہانی نہیں کرائی بلکہ چھ ہفتہ یا چھ دن کی بھی نہیں!

کل ہی تو رات کو ایس ایم ایس موصول ہوا کہ شکار پور کی فرحانہ بہن کے ۱۸ سالہ بھانجے کا انتقال ہوگیا ہے۔ گھر سے نکلا تھا کہ اسکوٹر رکشہ سے ٹکرا گیا۔اور بس سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی۔فرشتہ اجل موجود کہ واپسی کا سفر درپیش ہے۔ واپسی کے

لیے عمر کی کوئی قید تو نہیں۔ کبھی تو پیدا ہوتے ہی بلا لیا جاتا ہے اور کبھی پیدائش سے بھی قبل ..... کبھی ..... ہاں کبھی کبھی لمبی عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے کہ ''جان کر بھی کچھ نہ جانے۔''

پچھلے ماہ ہی تو ملی تھی نور جہاں بہن سے۔ سیلاب کی تباہی کے باعث کراچی ایک واقف کار کے ہاں مقیم تھیں۔ درمیانی عمر کی بڑی وضع دار خاتون۔ خاتون خانہ بولیں۔

''کوئی پریشانی نہیں لیکن نور جہاں بہن کا دل نہیں لگ رہا۔ گھر جانے پر مصر ہیں ہم کہہ رہے ہیں کچھ پانی اور اتر جانے دیں جیکب آباد جانے کے راستے بھی بند ہیں لیکن یہ ٹھہرنے پر آمادہ نہیں!''

وہ بولیں ''اتنی آؤ بھگت نے ہمیں بوجھل کر دیا ہے پھر اپنا گھر تو اپنا ہوتا ہے۔ پوتی پوتا بھی بہت ڈسٹرب کرتے ہیں اہل خانہ کو!''

سو وہ چلی گئیں اور کچھ ہی دن بعد فون پر اطلاع ملی کہ معمولی تکلیف کے باعث کراچی آ رہی تھیں کہ راستے میں ہی بلاوا آ گیا اور اپنے حقیقی گھر ہمیشہ کے مسکن کے لیے روانہ ہو گئیں۔ ان کے انتقال کی خبر سب پر بجلی بن کر گری کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ نہ عمر ایسی تھی نہ بیمار۔ بڑی ہنس مکھ، ملنسار اور مہمان نواز ..... کئی دن ان کی باتیں ہوتی رہیں۔

اور سوات کی عائشہ کا چہرہ تو پہروں نظروں سے اوجھل نہ ہو سکا۔ اس کا بس سولہ برس کا بیٹا آڑو کھا رہا تھا کہ دروازے پر یکے بعد دیگرے کئی گھنٹیاں بجیں۔ آدھا آڑو ماں کو تھمایا، دروازہ کھولا اور بولا:

''ماں ابھی آتا ہوں پانچ منٹ میں۔''

جانے کیا کام تھا پڑوس سے تایا کا بیٹا بلانے آیا گاڑی کی اگلی سیٹ پر اس کے ہمراہ بیٹھا اور پانچ ہی منٹ بعد ایکسیڈنٹ کی اطلاع آ گئی کہ گاڑی گلی کے موڑ پر کھمبے سے ٹکرا گئی اور موقع پر ہی وہ نوجوان جاں بحق ہو گیا جبکہ باقی دو دوست شدید زخمی ہوئے۔ عائشہ دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''ابھی تو آڑو میرے ہاتھ میں ہی تھا باجی! جانے کس کام سے گیا تھا۔ عجلت تو تھی طبیعت میں کہ جلدی جلدی ہو جائیں سب کام شام کے بھی صبح کو ہو جائیں ..... مجھے کیا پتہ تھا جانے میں بھی جلدی کرے گا!''

میں سوچنے لگی اس کو تو چھ ماہ قبل یہ بھی پتہ نہ تھا کہ بس چھ ماہ ہیں اس کے پاس!

پھر ایک روز بھائی آ گئے۔ ایک دم میرے ذہن میں وہی نوجوان آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

''بھائی وہ کس حال میں ہیں؟''

بھائی بولے ''وہ تو چھ ماہ بھی پورے نہ کر سکا اس سے قبل ہی بلاوا آ گیا اس کا۔ بہت باہمت نوجوان تھا۔ آخر لمحے تک ہمت ہاری نہ حوصلہ ..... بلکہ دلاسے دیتا رہا۔ اپنی صحبت سے سب کو محظوظ کرتا رہا۔ سب کام بھاگ دوڑ کر نمٹاتا رہا، تھا تو ہمیشہ کا نمازی لیکن ان دنوں میں تو اس کی نماز اور تلاوت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی تیاری دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی دوسرے ملک سے جاب کی آفر ہوئی ہے، ویزہ لگ گیا ہے۔ جس جس سے مل سکتا تھا فون کر سکتا تھا سب کو بتا کر معافی مانگ کر گیا۔ بہت پر امید ..... رب کی رحمت پر بھروسہ اس کا دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہر فون پر، ہر SMS پر ہر ایک کو یہی

جواب دیتا تھا کہ ''بہت اچھے حال میں رکھا ہوا ہے رب نے.....جس حالت میں وہ رکھے گا وہی سب سے بہتر حال ہے بندے کے لیے.....آخر ماں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔''

بھائی اس کی گہری یادوں میں کھو گئے۔ پھر بولے: ''ہم جیسے تو امتحان کے لفظ سے ہی ڈرتے تھے جو اچھے طالب علم ہوتے تھے ہمارے ساتھ وہ تو گویا امتحان کا انتظار کرتے تھے۔ رزلٹ کا دن ہمارے لیے خوف اور اندیشوں کا دن اور ان کے لیے گویا کامیابیوں اور بشارتوں کا دن ہوتا تھا۔ وہ تو بہت پر امید گیا دنیا سے!! امتحان کی تیاری جو کی تھی اس نے!! اسی لیے ملاقات کا انتظار بھی تھا اسے رب سے۔''

بھائی بہت سی باتیں بتاتے رہے کہ جب تشخیص ہوگئی حتمی رپوٹیں آ گئیں، بیماری کے دورانیے اور حساسیت کا اندازہ ہو گیا تو ڈاکٹرز نے کچھ بھی نہ چھپایا۔ اس نے نہ صرف خود کو بلکہ اپنی اہلیہ کو بھی سنبھالا۔ پانچ برس ہی تو ہوئے تھے شادی کو.....واقعی یہ دنیا عبرت کی جا ہے!

امام غزالیؒ نے کیسی تمثیل سے بیان کیا اس کو، کہ دل یکبارگی ٹوٹ سا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ''ایک آدمی کے پیچھے شیر لگ گیا وہ شیر سے بچنے کے لیے ایک کنویں میں کود گیا اور ایک رسی سے لٹک گیا جو دیکھا تو کنویں کی گہرائی میں اژدہا ہے۔ اسی دوران دو چوہے سفید اور سیاہ کہیں سے آ گئے اور جس رسی سے وہ لٹک رہا تھا اسی رسی کو کاٹنے لگے۔ دائیں طرف جو اس کی نظر پڑی تو شہد کا چھتا تھا۔ اس نے انگلی پر شہد لگایا اور چاٹنے لگا۔ شہد کی لذت میں وہ شیر، اژدہا اور چوہوں سے بے نیاز ہو گیا۔ بالکل یہی مثال انسان کی ہے۔ شیر موت ہے جو ہر وقت اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ وہ کنویں کا اژدہا اس کی قبر ہے جو بہر حال اس کی آخری منزل ہے۔ سفید اور سیاہ چوہے دن اور رات ہیں جو اس کی عمر کو مسلسل کتر رہے ہیں اور اسے گھٹانے میں مصروف ہیں۔ اور شہد وہ دنیا کی لذت ہے جو اسے موت، قبر اور گھٹتی ہوئی عمر ہر چیز سے بے نیاز کیے ہوئے ہے۔''

میں اس نوجوان کے چھ ماہ کے بارے میں مسلسل سوچتی رہتی کہ اس کی نمازیں کیسی نمازیں ہوتی ہوں گی۔ شاید اس کو حالت قیام میں دیکھ کر لگتا ہو کہ رکوع ہی نہ کرے گا یا سجدے میں دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہو کہ کبھی سر ہی نہ اٹھائے گا۔ یا دعا میں پھیلے ہاتھوں کو دیکھ کر لگتا ہوگا کہ کبھی آمین ہی نہ کہے گا۔ قرآن کی تلاوت وہ جس سوز و گداز سے کرتا ہوگا یقیناً سوز و ساز رومی سے آشنا ہوگا.....اس کی راتیں بھی رازی کی طرح پیچ و تاب میں گزرتی ہوں گی۔ زندگی کی حقیقت پا گیا وہ.....اس کا قلب واقعتاً قلب سلیم بن کر رہ گیا ہوگا کہ چند روزہ زندگی کے لیے کیا کسی سے بغض رکھوں۔ رب نے تو بس قلب سلیم ہی کا تقاضا کیا ہے کہ میرے در پر لے کر آنا اور تو اس نے کچھ بھی نہ مانگا بس دیا ہی دیا۔ بے حساب دیا.....ظرف سے زیادہ دیا..... شاید وہ کیلنڈر پر ہر روز دائرہ بناتا ہو۔ آخری متوقع یوم پر اس نے گہرا سرخ دائرہ بنا رکھا ہو۔ اور پھر روز کے دائرے بالآخر اس سرخ دائرے کی طرف بڑھتے گئے۔

دائرے سرخ نشان سے قریب تر ہو رہے تھے۔ وہ بھی سمجھداری سے دنیا اور کارِ دنیا کو سمیٹتا گیا ہوگا۔ ہر دینے والی چیز اپنے ہاتھوں سے دے دی ہوگی۔ سامانِ زیست سمیٹ لیا ہو

گا کہ بعد میں اہلیہ کو نہ سمیٹنا پڑے کہ اسے اور بھی دکھ سمیٹنا ہوں گے۔ ہاں شحّ نفس تو چھو کر بھی نہ گزرتی ہو گی اسے..... کیسا وسیع ہو گا اس کا قلب ..... ہر ایک کو معاف کر دیا ہو گا اس نے..... کسی سے کوئی شکوہ اور شکایت بے معنی ہو گا اس کے نزدیک۔ سورج نکلنے اور غروب ہونے کی حقیقت کوئی اس سے پوچھتا ..... ایک دن کی قیمت، گھڑی کے ہر گھنٹے کی قیمت، گھڑی کی ٹک ٹک کرتی سوئیاں اس کی حرکت قلب کو کیسے کیسے بڑھا دیتی ہوں گی۔ اپنی بیوی اور پھول جیسی بچی سے جدائی کی تیاریاں اس نے کیسے دل پر پتھر رکھ کر کی ہوں گی۔ مجھے لگا کہ وہ اپنے پیچھے ایک تحریر چھوڑ گیا ہے اور دور دور تک فضاؤں میں رقم ہے کہ

''تم میں سے کسی کے پاس چھ ماہ کی بھی ضمانت ہے۔ چھ دن یا چھ گھنٹے کی بھی نہیں۔ ہارٹ فیل اور برین ہیمبرج ہوتے تو سب دیکھتے ہیں۔ جوان جنازے بھی بوڑھے کاندھوں پر دیکھتے ہیں۔ لیکن تمھاری کارگزاری دیکھ کر تو یوں لگتا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ تم حیاتِ ابدی کے ساغر پی کر آئے ہو۔ تم جانے کے لیے نہیں آئے۔ تمھارے پاس کوئی ضمانت ہے زندگی کی .....ابھی بہت وقت ہے تمھارے پاس ..... یہ زمانۂ حال تو دنیا اور اس کی لذتوں کے سمیٹنے کے لیے ہے..... کوئی الارم بجے گا اور تم متوجہ ہو جاؤ گے کہ بس وقت سفر ختم ہونے کو ہے اور منزل قریب آ لگی۔ تب تم دنیا سمیٹ کر آخرت کی تیاری کرو گے۔ تم خواہشوں کی تکمیل کے لیے جیتے ہو۔ اور دل تمھارے ناکام حسرتوں کے مدفن ہیں۔''

آہ.....حقیت تو یہی ہے کہ ؎

خواہشوں کے میلے میں غفلتوں کے مارے ہم بس یہی سمجھتے ہیں کہ
ہم نے جس کو دفنایا بس اسی کو مرنا تھا!

محبت ایسا دریا ہے

رضیہ کو ہسپتال لے جایا جا رہا تھا..... ایمبولینس پورے شور شرابے سے ''ہٹو بچو'' کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے ''رشید ہسپتال'' پہنچ چکی تھی..... ایمبولینس کا دروازہ کھلتے ہی ہسپتال کا عملہ باہر آیا.....

رضیہ کی آنکھیں بند تھیں ..... ہونٹ ہولے ہولے ہل رہے تھے ..... سٹریچر پر لٹاتے ہوئے اس کی دائیں ہاتھ کی انگلیاں بھی متحرک ہوئیں..... دیکھتے ہی دیکھتے رضیہ سٹریچر سے آئی سی یو میں منتقل ہوگئی۔

اب تک میں چپ چاپ دیکھ رہا تھا..... لیکن ان چھبیس سالوں میں پہلی دفعہ ..... لفظاً یا محاورۃً نہیں حقیقتاً پہلی دفعہ میرے دل میں ہلچل سی پیدا ہوئی۔

میں نے بے اختیار اپنے دل پر ہاتھ رکھا ..... یہ رضیہ کو کہاں لے جا رہے ہیں؟؟

میرے پورے وجود میں سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔

''اگر رضیہ کو کچھ ہو گیا.....؟''

آئی سی یو میں سٹریچر پہنچا، میں نے دیکھا اس کے ہونٹ بدستور ہل رہے تھے.....!!

میں نڈھال ہو کر ویٹنگ روم کے صوفے پر ڈھے گیا!! اس کائنات میں کسی جاندار کو نہیں علم وہ بند آنکھوں سے کیا دیکھ رہی ہے اور بند ہونٹوں کو کیا حرکت دے رہی ہے۔ سوائے میرے یا میرے اللہ کے!!

میں چھبیس سالوں کا عینی گواہ ہوں وہ کیا کہہ رہی ہو گی بس ایک ہی فقرہ۔

''یا ودود! میرے لیے سلیم کے دل میں میری محبت پیدا کر دے۔''

یہ فقرہ وہ اتنے خشوع خضوع سے کہتی تھی کہ سننے والے سنتے تو ان کے دل لرز جاتے ..... لیکن اس نے کبھی یہ فقرہ کسی کو سنایا ہی کب تھا! یہ فقرہ وہ چوبیس گھنٹوں میں اتنا دہراتی کہ میں تنگ پڑ جاتا۔

''رضیہ بی بی تمھارے جیتے جی یہ محبت نہیں پیدا ہونے کی۔'' یہ سن کر وہ ساکت ہو جاتی ..... گونگی بہری ..... چند ہی لمحوں کے بعد یہ فقرہ وہ جائے نماز بچھا کر اتنے کرب اور دکھ میں اپنے اللہ کو سنا رہی ہوتی کہ میں قدم پٹختا دھپ دھپ کرتا گھر سے نکل جاتا۔

بے وقوف عورت!!

جو رتبہ تجھے بہو اور بیوی کی حیثیت سے مل گیا ہے یہ کم ہے؟؟ اپنی اوقات دیکھ اور اپنی خواہش دیکھ ..... ہونہہ ..... یہ منہ اور یہ مسور کی دال ..... کیا اس محبت کا حقدار سفینہ سے ہٹ

کرکوئی ہوسکتا ہے؟؟

سفینہ کا خیال دل میں آنے پر میری آنکھوں میں تارے سے ٹمٹمانے لگتے.....

سفینہ، میری چچازاد.....میری کلاس فیلو، میری ہم جولی، میری محبت، میری بچپن کی منگیتر.....!!

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلانے کے لیے تو سفینہ کا خیال ہی کافی تھا.....!! یہ منحوس بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑی.....!! یہ سوچتے ہی غصے سے میرا خون کھولنے لگتا۔ میری مٹھیاں بھنچ جاتیں..... یقیناً ماتھے پر بھی شکنوں کا جال بنا ہوتا ہو گا.....جس طرح سفینہ کی محبت میری رگ رگ میں بسی تھی اسی طرح رضیہ کی نفرت میرے روئیں روئیں میں رچ چکی تھی.....!!

جب بھی بے جی نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی میں ہمیشہ پھٹ پڑتا۔

''آپ چپ رہیں بے بے جی ..... آپ کا کیا دھرا ہے.....کیا دنیا میں کسی لڑکی کی بارات آج تک دلہن کے بغیر واپس نہیں ہوئی؟

کیا دنیا میں کسی کا باپ ایکسیڈنٹ میں نہیں مرا.....؟ کیا کسی کی ماں کو کینسر نہیں ہوا؟

پھر رضیہ کی بارات حق مہر کے معاملہ پر ضد میں آ کے واپس چلی گئی تو کیا انوکھا معاملہ ہوا؟

کیا اس کی شادی سے پانچ چھ ماہ قبل اس کا باپ ایکسیڈنٹ میں مر گیا تھا تو یہ میرا قصور تھا؟

کیا رضیہ کی شادی سے تین دن پہلے یہ علم ہونے پر کہ اس کی ماں کو جگر کا کینسر ہو چکا ہے وہ میری ضرورت بن گئی؟

بس بے بے جی آپ نے صرف اپنے بہنوئی بہن اور بھانجی کا سوچا کہ اس کی بارات واپس چلی گئی تو میری بہن جیتے جی مر جائے گی رضیہ کا طوق میرے گلے میں کیوں ڈالا؟

''پتر سلیم، ایسے بول نہ بولا کرو.....ٹھیک ہے سفینہ تمھاری منگیتر تھی لیکن اس کو تو ایک سے ایک بڑھ کے رشتہ مل سکتا ہے.....تم اس کو دوسری بیوی بھی بنا کر لا سکتے ہو لیکن رضیہ اس پرائے شہر میں، اجنبی در و دیوار اجنبی لوگوں میں مر جائے گی۔ کوئی اسے قبول نہیں کرے گا۔ اس کی کینسر کی مریضہ ماں، میری ماں جائی بہن مر جائے گی.....تم قربانی دے کر ایک نہیں کئی زندگیوں کو بچا سکتے ہو!! میری بہن کی زندگی..... میری بھانجی کی زندگی.....اور میری زندگی.....اپنی بہن کے دکھ پر تو میں جیتے جی قبر میں اتر جاؤں گی.....تم نہیں سمجھتے یہ کتنا ضروری ہے.....تم اس کو میرے پاس چھوڑ دینا اور جہاں نوکری کرو گے سفینہ کو وہاں رکھ لینا.....''

روتے روتے بے جی نے اپنی چادر میرے پاؤں میں ڈال دی۔

اس چادر نے مرتے دم تک میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں.....!!

بارات کی واپسی پر اسی کھانے اور انہی کپڑوں زیور میں رضیہ میری بیوی بن کر میرے ساتھ میرے گھر آ گئی.....میری ساس، میری خالہ، رضیہ کی ماں جس نے بیٹی کی بارات واپس جانے کے صدمے سے جیتے جی مر جانا تھا اور جس کی زندگی کی تگ و دو کے لیے میری ماں نے مجھے قربانی کا بکرا بنایا تھا.....

وہ ماں تو اس کی رخصتی کے چند گھنٹوں بعد ہی ابدی گھر رخصت ہوگئی.....!!

وہ نفرت جو رضیہ سے نکاح سے قبل محسوس ہو رہی تھی اب دو چند ہوگئی.....

ہونہہ.....!! ماں نے مرنا ہی تھا تو مجھ سے اتنی بڑی قربانی کیوں لی؟؟

ماں کے مرنے کے بعد دس دن کر کے ساس اور بہو دونوں واپس آ گئیں.....رضیہ کی طرف دیکھنے کی مجھے ضرورت نہ تھی۔ بے جی البتہ خوب چہک رہی تھیں۔

''پتر رضیہ کھا لو..... پتر رضیہ آرام کر لو.....'' میرا حال جل ککڑ والا ہو چکا تھا.....دس دن اکلوتا بیٹا فاقے سے رہے، سفینہ کو مناتے مناتے کھانے پینے کی ہوش تک بھلا بیٹھا، میرا فاقہ زدہ چہرہ نظر نہیں آیا اور بھانجی کی فکر ہے..... پتر رضیہ..... پتر رضیہ.....میں نے تلخی سے سوچا۔

رات گئے تک بے بے جی کے پاس برادری اور محلے کی عورتیں آتی رہیں۔ پتر رضیہ ان کے لیے بھاگ بھاگ کر چائے پانی کا انتظام کرتی رہی۔ دوڑتے بھاگتے اس کی موٹی سیاہ بالوں کی چٹیا، کالا ناگ بن کر ڈستی رہی.....تعزیت کرنے والوں میں میری چچی اور سفینہ بھی تھیں۔ میں نے سفینہ پر ''رضیہ کی اوقات'' ظاہر کرنے کے لیے اس کی موجودگی میں دانستہ طور پر اونچی آواز میں کہا۔

''بے بے جی میں سونے کے لیے مہمان خانے جا رہا ہوں۔ میرا دودھ یاد سے وہیں بھجوا دیں.....''

میرے اس فقرے کے جواب میں سفینہ بڑے ناز سے اٹھلاتی ہوئی میرے پاس آئی۔ اس نے وہی سبز اور سفید موتیوں کے کام کا جارجٹ کا سوٹ پہنا ہوا تھا جو پچھلی عید پر میں نے اسے خود خرید کر عیدی میں بھجوایا تھا.....

''ہے تو غمی کا موقع، تمھاری ساس کی تعزیت کے لیے آئی ہوں.....'' اس نے لفظ ساس خوب چبا چبا کر ادا کیا.....

''لیکن ایک دل خوش کن خبر ہے.....۔''

دل خوش کن خبر کے نام پر میرا دل دھڑکنے لگا.....اچھے برے دونوں طرح کے خیالات نے پنجے گاڑ دیے.....میں خوا مخواہ تھوک نگلنے لگا۔

''وہ یہ کہ میں نے حمزہ کے رشتہ کے لیے اقرار کر لیا ہے .....'' یہ ایک منوں ٹنوں وزنی ایٹم بم تھا جو میرے جسم و جان کے پرخچے اڑا گیا تھا..... مجھے بالکل نہیں یاد میں نے جواب میں کیا کہا، یا سفینہ کب اور کیسے کمرے سے رخصت ہوئی۔ اس وقت میں زمان و مکان سے لاتعلق ہو چکا تھا..... رضیہ میری خوشیوں کی قاتل جس نے پہلے ماں کو نگلا اب میری زندگی کو نگل چکی تھی.....ابھی تک میں نے اس کو دیکھا بھی نہیں تھا..... اور نہ ہی آئندہ زندگی میں حرص تھی۔

☆☆☆

''سلیم صاحب، آپ کی وائف کی حالت خاصی سیریس ہے'' ڈاکٹر نے ہاؤس جاب والے بچوں کی فوج میں سے باہر نکل کر مجھے مخاطب کیا.....اب اس کی لمبی چوڑی گفتگو میری رضیہ..... ہاں میری رضیہ کی بیماری کے بارے میں تھی جو انگریزی کی بھاری بھرکم بیماریوں کے ناموں، علامات پر مشتمل تھی۔ ہاؤس جاب والوں کے قلم تیزی سے اس ڈاکٹر کی گفتگو

اور اس کے اشارات قلمبند کرنے میں مصروف تھے..... وقفہ لے کر وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''فی الحال ہم سی ٹی سکین کریں گے، پھر پتہ چلے گا کہ یہ کیس کسی نیوروسرجن کو ریفر کرنا ہے یا سرجن کو.....'' گفتگو ادھوری چھوڑ کر وہ ایک نرس سے بولے۔

''سسٹر! آپ پیشنٹ کو سی ٹی سکین کے لیے لے آئیں.....''

چند ہی لمحوں میں رضیہ بے حس، ایک لاش کی طرح میرے سامنے سے سٹریچر پر گزری۔

''رضیہ.....'' میں بے تابی سے آگے بڑھا۔

بخدا..... رضیہ کی پلکیں حرکت میں آئیں..... اس کے ہونٹ ہلے اور میں اس کا ہاتھ تھامنے والا تھا کہ سٹریچر دوسرے کمرے میں چلا گیا.....

میں دل پر ہاتھ رکھ کر وہیں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

''رضیہ..... میں.....'' میرے ذہن میں سے الفاظ ایک ایک کر کے سارے کھسک گئے۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا..... ایک ایک کر کے پردے آنکھوں کے آگے سے ہٹتے چلے گئے..... مکافاتِ عمل..... نہیں تقدیر.....

ہاں بالکل ایسے ہی ایک دفعہ میں اس کی آس امید کو توڑتا دندناتا چلا گیا تھا..... وہ بھی اسی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

میرے رونے میں اور اس کے رونے میں کتنا فرق ہے..... میں نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ ویٹنگ روم کی چھت پر پنکھے، لائٹیں جل رہی تھیں اور اس پنکھے سے زیادہ تیزی سے میرا دل گھوم رہا تھا..... اس کی دھک دھک مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔

شادی سے دو تین ماہ بعد تک میں نے اس منحوس کی شکل نہ دیکھی..... یہاں تک کہ بے بے جی ایک دن پھر رونا دھونا لے کر بیٹھ گئیں.....

''پتر اب تو سفینہ اپنے گھر بیاہ کر چلی گئی ہے..... میاں کے ساتھ خوش باش ہے..... تو کب تک اس کا سوگ منائے گا۔ رضیہ بڑے نصیبوں والی ہے..... تہجد گزار، سگھڑ، باشعور، تمھاری منکوحہ ہے..... کب تک اسے بے مراد رکھو گے..... سارے غصے، گلے شکوے دھو دھلا کر اس کے حقوق ادا کرو گے تمھارا دل گواہی دے گا کہ اس سے اچھی بیوی تمھیں مل ہی نہیں سکتی..... وہ تو ملکہ بنائے جانے کے قابل ہے.....'' بے بے جی نے کہا۔

''ہاں.....'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''اپنے نصیبوں کی سیاہی میرے نصیب پر ڈالنے والی۔''

''نہ میرا پتر ایسے نہ کہہ، میرا جی کہتا ہے تم بڑے خوش رہو گے اس کے ساتھ..... نیکی کی ہے تو اس کو نبھاؤ بھی.....'' بے بے جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا..... ''تم خود نہیں دیکھ رہے میں کیسے گھٹنوں کے درد کی مریضہ بن گئی تھی..... اللہ نے ٹانگوں میں کیسا جادو بھر دیا ہے۔ میری خوراک، دوا کے ساتھ پانچوں نمازوں کے بعد مجھے پانی دم کر کے دیتی ہے..... تو ایک دفعہ سوچ تو سہی کیسا ظلم کر رہا ہے اس معصوم جان پر.....'' بے بے جی نے دکھ سے کہا۔

اب میں چپ رہا..... دل چاہتا تھا کھٹاک سے جواب

دوں ۔''آپ کے گھٹنوں کا درد میرے دل میں منتقل ہو گیا ہے.....میرا پورا وجود سراپا دکھ بن گیا ہے.....''لیکن میں چپ رہا..... بے بے جی کے آنسو میرے فیصلوں کے آگے بند باندھ دیتے تھے۔

☆☆☆

شادی کے بعد ابھی تک میں رضیہ کے پاس نہ گیا تھا۔ سارا دن کام کاج کر کے رات کو وہ بے بے جی کے ساتھ انھی کے کمرے میں سو جاتی .....میرے کان تو بند نہ تھے۔کئی دفعہ بے بے جی کی پکار سنائی دیتی۔

''رضیہ پتر اپنے کمرے میں سو جا۔''

''نہیں خالہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی رات کو سانس کی تکلیف ہو جاتی ہے آپ کے پاس ہوتی ہوں تو سکون سے رہتی ہوں۔''

میں کانوں میں تیل ڈال لیتا.....گویا سنا ہی نہیں.....سچ بات تو یہ ہے کہ رضیہ نے کبھی بلانے کی یا دل لبھانے والی بات ہی نہ کی تھی ..... یہ ساری باتیں تو سفینہ کے لیے سجتی تھیں..... بس خاموشی سے کھانا آگے رکھ دیتی ..... جوتے پالش ملتے، کپڑے پریس کیے ہینگر میں ہوتے ..... میری پسند کی وہ چیزیں جن کے لیے میں مدتوں بے بے جی سے فرمائش کرتا تھا خود بخود بن مانگے ملتیں..... یہ ایک فائدہ تھا جواب تک شادی کا ملا تھا ..... ارادہ یہی تھا کہ جب تک تڑپا سکتا ہوں تڑپاتا رہوں .....لیکن ایک دن سفینہ ہنستی کھلکھلاتی زیور سے لدی پھندی بڑے ناز وادا سے مجھے ملنے آئی.....اس کے انگ انگ سے خوشیاں پھوٹ رہی تھیں۔

''تائی جی میں یو کے جا رہی ہوں .....''اس نے آنکھ اٹھا کر بھی مجھے دیکھنا گوارا نہ کیا۔

اس کی بے نیازی سے دل و دماغ پر ایک قیامت بیت گئی۔ وصال نہ سہی نظروں میں تو رہی تھی ..... دل نے کہا۔ زندگی میرے لیے کانٹوں سے زیادہ سنگین ہو گئی۔

بے بے جی نے اس کی خوب آؤ بھگت کی .....رضیہ بھی اس کے آگے بچھ بچھ گئی۔

سب سے الوداعی ملنے کے بعد وہ اپنا گھر، محلّہ، شہر یہاں تک کہ ملک بھی چھوڑ گئی.....جاتے جاتے اس نے بس یہی کہا ''سلیم یہ مت سوچنا کہ میں تمھاری خاطر وہاں جا رہی ہوں میں اس لیے جا رہی ہوں کہ محسن کی جاب وہاں ہے۔اور میں وہاں اس سے زیادہ بہتر زندگی گزار سکتی ہوں.....''

☆☆☆

سفینہ کے جانے کے بعد کئی ہفتے مجھے ایسے ہی گم سم حالت میں رہتے ہوئے گزر گئے ..... بے بے جی دن رات سمجھاتی رہتیں.....

پتر سلیم ایسے مت کرو۔ میں کیا منہ دکھاؤں گی اپنی بہن کو! بالآخر پتر سلیم کو ہتھیار ڈالنا پڑے ..... دل کو سمجھانے بجھانے میں بہت وقت لگا اور میں نے رضیہ کو بیوی کے طور پر قبول کر لیا۔لیکن ابھی تک میرے دل میں وہی کمینگی تھی اس کے چہرے پر خوشیاں رقص کرتا دیکھ کر میرا سینہ تنگ پڑ جاتا۔

ہوسکتا ہے اس کی جگہ سفینہ ہوتی ،ہنستی کھلکھلاتی ..... اور میرا دل بند ہونے لگتا..... بے بے جی کے وعظ اب بھی جاری تھے۔

''پتر رضیہ دعا کیا کرو اللہ اس کے دل میں تمھاری محبت ڈال دے۔''

ہونہہ.....محبت اور رضیہ بی بی سے، میں حقارت سے سوچتا۔

☆☆☆

یہ ایک گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ والا دن تھا جب مجھے بے بے جی کو بخار کی حالت میں ہسپتال لے جانا پڑا.....ان کا بخار اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا.....رضیہ نے ہی منت کر کے انھیں ہسپتال کے لیے راضی کیا تھا۔ بلڈ ٹیسٹ، یورن ٹیسٹ، شوگر، یورک ایسڈ، کولیسٹرول.....کس کس بیماری نے بے بے جی پر حملہ نہیں کر دیا تھا.....میری دنیا اندھیر ہوگئی تھی.....میں تو بے بے جی کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا.....شام میں جب انھیں واپس گھر لے کر آ رہا تھا، میرے دل و دماغ میں ایک ہی جنگ ہو رہی تھی.....آخر اس نے میری زندگی کی آخری اور سب سے بڑی خوشی کو چھین لیا ناں.....!!!

میری منگیتر، میری خوشیاں، میری ماں، میری زندگی.....کاش، کاش یہ عورت اس دنیا میں نہ آئی ہوتی..... اور اگر آ ہی گئی تھی تو اس کی ماں نے اس کا گلا کیوں نہ دبا دیا.....!!!

میری بے نیازی، لاتعلقی اور بے بے جی کی پریشانی سے رضیہ کے ہونٹوں کو چپ لگ گئی.....کبھی کبھی بے بے جی اس کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیتیں.....چومتیں.....لرزتی کانپتی آواز میں یہی کہتیں۔

''دعا مانگ اللہ اس کے دل کو تمھارے لیے نرم کر دے.....'' کئی دفعہ انھوں نے مجھے پاس بلایا، بٹھایا.....ان کی گیلی گیلی آنکھوں میں ہزار ہا شکوے ہوتے ..... میں جان بوجھ کر بہرہ گونگا بن جاتا.....!!

☆☆☆

بے بے جی کا چالیسواں کر کے میں نے پہلا کام یہ کیا کہ آسٹریلیا کے لیے اپلائی کر دیا.....جوں جوں کاغذات تیار ہوتے جا رہے تھے میں روحانی اور جسمانی طور پر رضیہ سے مزید دور ہوتا جا رہا تھا..... یہاں تک کہ جس دن میں نے ٹکٹ وصول کیا.....تو میری زندگی سے رضیہ کی آس امیدوں کا ٹکٹ کٹ چکا تھا۔

مجھے اب بھی یاد ہے وہ کتنا کلپی تھی میرے جانے کا سن کر.....روتے روتے وہ بے حال ہوگئی تھی.....میں نے تو کبھی آپ کا برا نہیں چاہا..... مجھے سزا مت دیں میں اکیلی رہ جاؤں گی، کوئی دوسرا ہٹ بھی نہیں، مجھے خوف آتا ہے ..... ایئرپورٹ روانگی تک یہی گنے چنے فقرے تھے جو وہ بار بر دہراتی.....میں سنی ان سنی کرتے ایئرپورٹ اور ایئرپورٹ سے آسٹریلیا منتقل ہوگیا۔

میرے انتقام کی پہلی قسط آج مکمل ہو چکی تھی.....

ملک، گھر بار، دوست احباب سب کچھ چھوڑنے کا غم، جانے کی خوشی میں کہیں دب دبا کر رہ گئے.....!!

سڈنی میں قیام، وہاں کے پہاڑوں، جنگلوں، سمندروں کا حسن مجھے مبہوت کرنے کو کافی تھا..... سچی بات تو یہ ہے کہ وہاں کی زندگی نے مجھے رضیہ تو رضیہ، سفینہ کی یاد تک سے بے نیاز کر دیا۔

آسٹریلیا میں قیام، نوکریوں کی تلاش عارضی ملازمت، ایک جگہ سے دوسری جگہ ٹرانسفر نے بہت مدت تک مجھے پاکستان اور پاکستان والوں کی یاد سے بھی غافل کیے رکھا۔

میں اس زندگی میں مگن تھا..... میری وجہ سے کس کس کی زندگی ختم ہو رہی تھی یہ جاننے کی مجھے ضرورت نہ تھی۔

☆☆☆

''آپ کی مسز کے برین میں ٹیومر ہے.....'' سسٹر نے مجھے پرانی یادوں سے باہر نکال کھڑا کیا۔

صحیح معنوں میں یہ خبر سن کر مجھے اپنے مضبوط توانا اور چھ فٹ کے وجود میں زلزلے کی طرح جھٹکے محسوس ہونے لگے۔

''ٹ ..... ٹیومر.....'' میں سخت ہونق تھا..... ''سسٹر میری بیوی کہاں ہے.....'' میں ہوش وحواس سے بیگانہ تھا۔

''آیئے میرے ساتھ چلیں'' سسٹر نے مجھے کہا۔ کافی فاصلے پر ٹھنڈے اور تاریک کمرے میں وہ بیڈ پر پڑی تھی۔

''کیا یہ کومے میں ہیں.....؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ حتمی نہیں کہہ سکتے لیکن لگتا یہی ہے کہ یہ کومے میں ہیں کوئی رسپونس نہیں دے رہیں۔'' سسٹر نے کہا۔

میں سسٹر سے بے نیاز ہو کر رضیہ کی طرف لپکا۔

''رضیہ تم ٹھیک ہو..... رضیہ..... آنکھیں کھولو ناں.....

رضیہ تم میری بات سن رہی ہو.....؟ تم جواب کیوں نہیں دیتیں.....؟''

''آپ مریض کو ڈسٹرب نہ کریں پلیز.....'' سسٹر نے مجھے ٹوکا اور تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ کمرے کے دروازے سے باہر آتے ہوئے میرے ذہن کے پردۂ سکرین پر ایک اور تصویر آئی۔

ہاں ..... بالکل ..... واقعی اسی طرح میں نے بھی اسے کمرے سے نکال باہر کیا تھا جب وہ بے بے جی کے کہنے پر تیار ہو کر شادی کے سات آٹھ ماہ بعد میرے کمرے میں آئی تھی ..... بلکہ میرے سے پہلے ہی وہ بے بے جی کے ساتھ کمرے میں موجود تھی..... اس نے ہلکا سا میک کیا ہوا تھا..... نازک سی جھمکیاں اور سونے کی چوڑیوں نے کسی حد تک اسے دلہنا پا بخشا تھا بے بے جی کے کمرے سے جانے اور سونے کا انتظار کرتا رہا اور جب بے بے جی کو کمرے میں سوتا دیکھ کر آیا تھا تو اسی طرح میں نے اسے اشارہ کیا تھا۔

صاف، چبھتا واضح اشارہ کمرے سے نکل جانے کا.....

اسی طرح شاید وہ جانا نہیں چاہ رہی تھی جیسے میں آج کمرے سے باہر نہیں آنا چاہ رہا تھا.....

اسی طرح وہ بھی صبر کے لمبے گھونٹ پی رہی تھی اس طرح اک لمبی سانس اس کے سینے سے نکلی تھی جیسے آج میرے سینے سے.....

لیکن اس آہ اور اس آہ میں اتنا فرق کیوں ہے؟ آسٹریلیا میں قیام کے ٹھیک دس ماہ بعد عید کے موقع پر جب سب پاکستانی اپنے اپنے دوست، احباب کو عید کی مبارکباد دے رہے تھے تو میرے دل میں ہلچل سی پیدا ہوئی..... میں کس کو فون کروں؟

میں نے بہت سوچ کر سفینہ کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ اس وقت اپنے میاں کے ساتھ عید منانے کہیں دور دراز شہر میں عید ملن کے لیے گئی ہوئی تھی۔

رضیہ کو میں نے فون نہیں کیا ..... میری خوشیاں چھیننے والی کس طرح میری عید کی خوشیوں میں شامل ہوسکتی ہے؟؟

یوں میری عید تو اس کے بغیر دوست احباب کے ہلے گلے میں بہت اچھی گزر گئی لیکن اس کی میرے بغیر کس طرح گزری..... مجھے یہ نہیں معلوم ہوسکا.....!!

☆☆☆

میرے شہر بلکہ میرے محلے سے آنے والا حماد اکبر..... غیر متوقع طور پر مجھے ساؤتھ سڈنی کے شاپنگ مال میں مل گیا.....اسے تو یقیناً میری آسٹریلیا آمد اور رہائش کا علم تھا لیکن میں تو اس کی آمد سے بے خبر تھا۔

بہت دیر میں اسے گلے ملتا، آنسو پونچھتا رہا.....اسے دیکھ کر مجھے اپنی ماں اور اس کی ماں کی دوستی یاد آئی۔ پھر مجھے اس کے پڑوس میں آباد سفینہ یاد آئی۔

سفینہ کے بعد مجھے رضیہ کی یاد آئی..... میں بہت دیر تک ہچکچاہٹ کے عالم میں رہا۔

کن لفظوں میں اور کیا پوچھوں؟؟ اپنے ذہن میں میں مناسب سے الفاظ ترتیب دے رہا تھا جب اس نے خود ہی میری مشکل آسان کردی۔

''ارے سلیم بھائی آپ کو علم ہے رضیہ بھابھی کافی دن ہسپتال میں ایڈمٹ رہی ہیں۔''

''کیا ہوا؟'' میں نے اٹکتے اٹکتے پوچھا۔

''آپ کو نہیں علم وہ خاصی بیمار رہی ہیں۔'' وہ حیرانی سے بولا۔

میں نے سر ہلا دیا.....نہیں کہنے کی جرات مجھ میں پیدا نہ ہوسکی۔

''کچھ گائنی کا مسئلہ تھا.....تفصیل کا تو مجھے نہیں علم۔'' اس نے کہا۔

میں گم سم سا اپنے فلیٹ میں واپس آ گیا۔ رات کو بالآخر میں نے رضیہ کا نمبر ملایا۔

''کیسی ہو؟'' میں نے قدرے بے نیازی سے کہا۔

''آپ کون صاحب بات کر رہے ہیں؟'' اس نے پریشان ہوکر پوچھا.....

اس کی بے نیازی پر میرا خون کھول اٹھا۔

''کون بات کر رہا ہوں؟'' میں نے دھاڑ کر پوچھا۔

''اوہ.....'' وہ گھبرا گئی.....

''السلام علیکم آپ کیسے ہیں؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

''سنا ہے کہ بیمار رہی ہو.....'' میں نے پوچھا۔

''جی.....'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''کیا ہوا تھا؟.....'' غصہ تو بہت آیا لیکن کیا کہتا وہ زیادہ لمبی بات کی عادی نہ تھی یا مجھے اس کی لمبی گفتگو کی چاہت نہ تھی اس لیے وہ مجھ سے مختصر بات کرتی تھی۔

''ابارشن ہوگیا تھا.....'' اس کی آواز میں اب بھی نمی گھلی ہوئی تھی۔

''اوہ.....'' مجھے بھی افسوس ہوا.....پھر فوراً اپنے آپ کو تسلی دے لی۔ اچھا ہوا..... پاکستان میں زنجیر کی ایک مضبوط کڑی بنتے بنتے ٹوٹ گئی.....

میں نے اسے اپنا فون نمبر دے دیا کہ ضرورت پڑے تو

اس نمبر پر رابطہ کر لینا..... خدا حافظ کہے بغیر ہی میں نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

اس کی تمام رپورٹس میرے اندازے سے بھی زیادہ خطرناک تھیں.....

میں سارا سارا دن اس کے پاؤں کے پاس بیٹھا رہتا..... وہ بہت کم آنکھیں کھولتی ..... آنکھیں کھولتی تو کسی قسم کی پہچان کی رمق ان کے اندر نہ ہوتی۔

سفید، بے جان آنکھیں ..... کبھی کبھار جب وہ بڑی بڑی سفید آنکھیں کھولتی ..... مجھے سفید ناگن کی سی ان آنکھوں کے خوف سے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوتا..... گھبرا کر میں جلدی سے سسٹر کو آواز دیتا۔

''سسٹر اس کی آنکھیں بند کر دیں.....''

بہت دیر تک اس کی بے نور، سرد آنکھیں دیکھ کر میں اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتا رہتا.....

یہ سفید بے جان آنکھیں مجھے ایک اور دنیا میں لے گئیں.....

ہاں بالکل ایسے ہی سفید آنکھیں میں نے کس کی دیکھی تھیں؟؟

ہاں یاد آیا..... یہ تو میری اپنی آنکھیں تھیں جو رضیہ کے ہوش وحواس میں، اس نے دیکھی تھیں۔

خوف سے میرا رواں رواں کانپنے لگا۔

میرے خدا! کیا اس کا بھی میری بے جان سفید آنکھیں دیکھ کر دہشت سے یہ حال ہوا ہوگا؟؟

ایسے ہی اسے بھی میری بے جان، سرد آنکھوں کا عذاب سہنا پڑا ہوگا؟

یہ سوچتے ہی ایک دم پہلے ندامت اور پھر محبت کی لہر میرے اندر سے اٹھی اور میرا تن، من دھن بہا کر لے گئی۔ میں بے اختیار رونے لگا۔

میرے روئیں روئیں سے خوف کی بجائے محبت کی پھوار بہہ رہی تھی.....!!

میری رضیہ..... میری زندگی .....بس ایک دفعہ ٹھیک ہو جاؤ میں تمھارے پاؤں میں گر کر معافی مانگ لوں گا.....

میں نے تم پر کس قدر ستم ڈھائے!! کس کے کہنے پر؟؟ صرف اور صرف نفس کے کہنے پر۔ مجھے اس لمحے اپنی بے بے جی بہت یاد آئیں جو اکثر اونچی آواز میں شعر پڑھا کرتی تھیں ۔

مر وے خصما مر
توں مریں تا وسے گھر

میں انجان اور حیران ہو کر پوچھتا۔

''بے بے جی یہ کون سا خصم ہے جس کو مار کر آپ اپنا گھر آباد کر رہی ہیں؟''

''میرے سلیم پتر، نفس ہی وہ خصم ہے جس کو جب تک پالتے پوستے رہیں گے آپ کا اگلا گھر برباد ہوتا رہے گا ..... نفس مار لیا تو یہ اور وہ دونوں گھر بڑی آسانی سے آباد ہو جائیں گے.....!!''

مجھے اپنے آئینے میں اپنے نفس کی مکروہ اور گھناؤنی تصویر نظر آ رہی تھی ..... بدبودار، متعفن ..... غلیظ، سڑاند والا نفس جس نے یہ بھی نہ سوچا کہ میرے کس قول اور کس فعل سے رضیہ

پر کیا بیت رہی ہے.....!

آسٹریلیا میں میرے تین سالہ قیام کے بعد مجھے شہریت ملی اور میں پاکستان آیا..... دو چار سوٹ، پرفیوم، شیمپو، شہد کی سوغات لے کر..... میں نے اپنی آمد سے رضیہ کو لاعلم رکھا ہوا تھا.....

اس کے چہرہ پر نقاہت تھی اور چال میں مردنی چھائی ہوئی تھی.....سال میں ایک آدھ دفعہ بھیجے گئے میرے پیسوں کا حساب کتاب میرے بن کہے، میرے آگے رکھ دیا۔

''میں نے کب تم سے یہ حساب کتاب مانگا ہے؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا..... ''مجھے معلوم ہے بے بے جی کا کافی سرمایہ چھوڑ کر گئی ہیں، دکانوں کا کرایہ بھی آجاتا ہے.....تم مجھ سے زیادہ مالدار ہو.....'' جلے بھنے لہجے میں، میں نے کہا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے.....'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''بے بے جی کا سارا سرمایہ، جوں کا توں پڑا ہے..... وہ ان کا ورثہ ہے میں خود سے کیسے تقسیم کرسکتی ہوں اور دکانوں کا کرایہ میں نے ایک ہسپتال میں جگر کے کینسر کے علاج کے لیے وقف کر دیا ہے..... ہر ماہ خود بخود وہ کرایہ کینسر وارڈ میں منتقل ہو جاتا ہے..... بے بے جی اسی مرض سے ختم ہوئی تھیں ان کے ایصال ثواب کا اس سے اچھا مصرف کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا.....''

پہلی دفعہ اس کی لمبی وضاحت یا گفتگو سن کر مجھ پر جھلاہٹ طاری نہیں ہوئی.....

مجھے لگا مجھے وہ اچھی لگ رہی ہے۔

کچھ عجیب سی کیفیت تھی میری۔ میں خود سمجھنے سے قاصر تھا۔ بہرحال اس کا یہ فائدہ ہوا کہ میرے ڈیڑھ ماہ کے قیام میں کوئی خاص واقعہ یا تلخی نہ آئی اور واپسی کی تاریخ آ گئی۔

جب میں سامان پیک کر رہا تھا.....وہ بڑی بے بسی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ابھی وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے ڈرتی جھجکتی تھی۔

''آپ آسٹریلیا نہ جائیں'' ایک دن بڑی ہمت کر کے اس نے کہا۔

مجھے تو جانو پتنگے لگ گئے۔

''آسٹریلیا نہ جاؤں؟'' میں نے سیخ پا ہو کر کہا۔ ''دنیا مرتی ہے آسٹریلیا جانے کے لیے اور تم میری بندھی روزی پر لات مار رہی ہو.....''

''روزی کی تو یہاں بھی کمی نہیں، اکیلے میں میرا دل گھبراتا ہے.....'' اس نے جرح کی۔

''اگر میرا دانہ پانی وہاں لکھا ہے تو تم کا ہے کو روکتی ہو! اور اکیلے پن والی بات بڑی فضول ہے..... بھلا جو تم نے گھر میں سلائی سینٹر کھول رکھا ہے، دس پندرہ لڑکیاں کپڑے سینا سیکھ رہی ہیں وہ تمھاری دوسراہٹ کے لیے کافی نہیں؟'' میں نے جواب دعویٰ دائر کیا۔

گھر سے نکلتے ہوئے اس کی بے بسی، آنسو پونچھنا اور میرا آنکھوں کا رنگ یقیناً کسی سفید پتھر سے مشابہ ہوگا۔

بے جان بے حس پتھر سے بنی آنکھوں نے اسے کتنا دکھ دیا ہوگا، کاش میں نے یہ سوچا ہوتا!

☆☆☆

زندگی کے اگلے پانچ سال جتنے تلخ رضیہ کے لیے تھے، میرے لیے بھی کم نہ تھے۔ میں اس کی حسرتوں کو اس کے سینے میں قید کر کے یہاں آیا تو پورا آسٹریلیا میرے لیے قید خانہ بن چکا تھا..... زندگی کے دس سال میں اپنے کردہ اور ناکردہ جرم کی بنا پر جیل میں رہا۔

سفیان، ایک پاکستانی جو کہ عرصہ دراز سے یہاں پر چھوٹی موٹی نوکریاں کر رہا تھا..... کئی طرح کے الزامات میں قید بھگتتا ہی رہتا تھا، میں لاعلمی میں اس کی دوستی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ نائن الیون کا واقعہ تازہ تازہ ہونے کی وجہ سے ہلکا سا جرم بھی ایک مسلمان کو مشکوک کر دیتا..... میرے کاغذات بھی ادھورے نکلے، میری نوکری بھی غیر قانونی ٹھہری، ٹیکسوں کی ادائیگی میں کئی دفعہ ڈنڈی مارنے کا جرم بھی اب قابل گرفت ٹھہرا اور میں دہشت گرد قرار دے دیا گیا.....!!!

میں نے رضیہ کے خانہ دل کو برباد کیا تھا اس کی آرزوؤں، امنگوں کو تہہ و بالا کر کے دہشت گردی ہی تو کی تھی اس کا احساس مجھے جیل جا کر ہوا ..... ان دس سالوں میں سوائے میرے رب کے کوئی میرا نہ نکلا ..... دنیوی قانون کی پابندی نہ کرنے کا مجرم ہوتا تو کئی ناشناسا چہرے بھی پردیس میں شناسا بن کر کام آتے ہیں یہاں تو الزام ہی دہشت گردی کا تھا..... میں بہت چیخا چلایا..... میرے چہرہ پر داڑھی نہیں، سجدہ میں نے کبھی نہیں کیا، محض ایک ہینڈ بیگ لے کر جانے پر جس کے اندر کیا ہے میں خود بھی نہیں جانتا مجھے دہشت گرد کیوں ٹھہراتے ہو.....؟؟

میں اپنے کسی ہم وطن کی شکل کو ترس گیا۔ پھر میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ بے بے جی کی وفات اور میرے آسٹریلیا آنے کے بعد رضیہ نے محلے کی بچیوں کو سلائی سکھانے پر کیوں رکھا!!..... اسی احساس نے کہ وہ اپنے علاوہ کسی اور کی شکل دیکھنے کو ترس رہی ہے..... میں نے سچے دل سے معافی طلب کی۔

میرے اللہ دنیا مجھے ناکردہ گناہ کا مجرم ٹھہرا رہی ہے اور تو جانتا ہے کہ میں ایک پاکباز، معصوم، تہجد گزار عورت کا کتنا ''عادی مجرم'' ہوں.....!!

زندگی کے یہ دس سال، دس کٹھن وادیاں تھیں جن پر چڑھنے اترنے کی مشقتوں نے مجھے تھکا دیا تھا لیکن اس مشقت نے مجھے میرے ماضی سے آگاہ کیا۔ ماضی سے آگہی نے مجھے دنیا سے بے نیاز اور رب کے قریب کر دیا۔

رب کی قربت نے مجھ پر اپنی اوقات ظاہر کر دی۔ اس اوقات نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ جیل میں، میں نے از سر نو نمازیں درست کیں، مسلم ساتھی طٰہٰ نجیب نے جس کا تعلق شام سے تھا۔ مجھے قرآن کے مفہوم سے آشنائی بخشی..... قرآن کی آشنائی نے میرے سامنے ایک نئی دنیا متعارف کروائی۔

اس دنیا کی ایک ایک چیز، ایک ایک سانس، ایک ایک حرف رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا.....!!

میرا رونا بلکنا، میری آہ سحر گاہی نے مجھے جیل کی قید سے دنیا کے تپتے صحرا میں لا کھڑا کیا۔

پہلا کام تھا رضیہ سے معافی کا..... لیکن میرے پاس اب کوئی سرمایہ، کوئی شناخت نہ تھی کہ میں پاکستان جاتا..... مجھے ملازمت تلاش کرنا تھی..... ٹکٹ کے علاوہ اتنے پیسے جمع کرنے

تھے کہ میں رضیہ کے لیے دنیا جہاں کی خوشیاں خرید سکتا۔ میں نے دس سال کی مختصر روداد سنانے، معافی مانگنے کے لیے اس یقین کے ساتھ کہ حماد اکبر سے میری گم شدگی کی معلومات تو اسے ہوں گی اسے فون کیا۔

بہت دیر بلکہ بہت دنوں ہفتوں تک فون کی بیل کی بجائے ٹیپ چلتی رہی .....حماد اکبر بھی کہیں اور شفٹ ہو چکا تھا۔صحیح معنوں میں اِن پلوں کے نیچے سے ان دس سالوں میں بہت سا پانی بہہ چکا تھا..... میں کس سے پوچھوں، کیا کروں، کیا میری سزا ابھی باقی ہے۔میری داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی تھی.....میں ایک بند گلی میں کھڑا راستہ ڈھونڈ رہا تھا.....اور راستہ کہیں سے نہیں مل رہا تھا.....

خود بخود میری پیشانی اسی ہستی کے آگے جھک گئی۔اس عاجز، لاچار، بے بس، بے کس، غریب، فقیر، سیاہ کار، خطا کار نے تو جب بھی اس سے مانگا اس نے عطا کیا .....جیل کی تنہائیوں میں میرے لیے وہ دوسرا بن گیا تھا.....

کچھ ہی عرصہ میں میری پکار کا جواب مل گیا، مجھے ملازمت کے ساتھ کمپنی کی طرف سے ٹکٹ کی آفر بھی تھی جسے قبول کرنے میں میں نے لمحہ کی تاخیر نہ کی.....

میرا واپسی کا سفر خفیہ تھا.....میرے ہاتھ میں صرف ایک سفری بیگ اور دل محبتوں کے خزانے سے بھرا ہوا تھا ..... سارے راستے میں رضیہ سے معافی تلافی کے فقرے ترتیب دیتا گیا.....

میری آزمائش کا سفر اس وقت اختتام کو پہنچا جب مجھے پتہ چلا کہ وہ تو بہت عرصہ سے اپنے آبائی گاؤں جا چکی ہے..... گھر پر اب تالا لگا تھا ..... جب اس کے آبائی گاؤں پہنچا تو رضیہ مجھے کہیں نظر نہ آئی .....گھر میں دو چار بچیاں سیپارہ پڑھ رہی تھیں اور ایک سفید بالوں والی اماں قریب ہی سر باندھے چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی.....

ڈرتے جھجکتے جب میں اندر کمرے میں داخل ہوا تو سیپارہ پڑھنے والیوں میں سے ایک بچی میرے پیچھے آئی۔

''چاچا.....چاچی رضیہ بلا رہی ہے.....''

میں ہونق بنا صحن میں آیا تو وہ بوڑھی عورت برسوں کی بیمار اب بیٹھنے کی کوشش میں تھی۔

''تم رضیہ ہو.....؟'' حیرت سے میری چیخ نکل گئی۔

وہ ہلکا سا مسکرائی.....''ہاں میں نے بھی تمھیں نہیں پہنچانا تھا سفید داڑھی والے بابا جی لگ رہے ہو بالکل.....''

اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی..... بچی کو اس نے اشارہ کیا وہ پلک جھپکنے میں بوتل کے جن کی طرح جوس کی بوتل لے آئی.....میں نے لاڈ سے کہا''اچھی بات ہے جوس پر ٹرخا رہی ہو مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے۔''

وہ مسکرا دی.....اس کی مسکراہٹ میں ملکوتی پن تھا.....

''میں چل نہیں سکتی، ایک کام والی عورت صبح شام کھانا بنا جاتی ہے وہ بس آنے ہی والی ہے.....''اس نے کہا۔

''چل نہیں سکتیں.....کیا مطلب؟'' میرا سانس رک گیا۔

''شوگر زیادہ ہو گئی تھی بس ٹانگیں مجھ گنگا ہگار کا بوجھ نہیں اٹھا سکتیں.....''اس کی آنکھوں میں پانی جھلمل کر رہا تھا۔

''اور یہ پٹی کیوں باندھی ہے .....؟'' مجھے چھٹی حس بیدار کر رہی تھی.....

''پتہ نہیں سر میں درد ہوتا ہے ، دل چاہتا ہے ٹکریں ماروں۔ درد کی شدت سے کئی دفعہ بے ہوش ہو جاتی ہوں۔ پتہ نہیں علاج کے باوجود شفا نہیں مل رہی.....''

میرا مضبوط دل شاخ سے ٹوٹے پتے کی طرح لرزنے لگا۔ میں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا.....

''رضیہ تم گھبراؤ نہیں میں تمھارا مکمل علاج کرواؤں گا، تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی.....''میں نے اسے تسلی دی۔

''اور تم مجھ سے یہ نہیں پوچھو گی کہ میں دس سال کہاں مرتا کھپتا رہا.....اچھی بیوی ہو.....''میں نے نروٹھے پن سے کہا۔

وہ ہنس پڑی.....اس کے چہرے کی جھریوں نے اسے عمر سے چار گنا زیادہ بوڑھا کر دیا تھا.....وہ کہنے لگی۔

''پہلے کبھی پوچھا تھا میں نے.....؟''

میں، میرا جوش ولولہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا..... واقعی سلیم تم بڑے ظالم اور سنگدل ہو.....کیا تم نے پہلے کبھی اس سے رابطہ کیا تھا جواب استحقاق سمجھ بیٹھے ہو.....میں نے اپنے نفس کو کچوکا لگایا۔

اس نے کام والی ماسی سے آج میری پسند کا کھانا بنوایا.....شامی کباب، پلاؤ اور ڈھیر سارا زردہ..... میں نے مدتوں کے بعد پیٹ بھر کے کھانا کھایا..... ہر لقمہ پر میں اس کا شکریہ ادا کرتا رہا.....رضیہ کے ہاتھ کا ذائقہ تو نہیں، خلوص ہر لقمے پر محسوس ہوتا رہا۔

''تم ساتھ نہیں دو گی کھانے میں میرا.....؟''میں نے اسے بیکار بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں مجھے یہ چیزیں منع ہیں، سادہ جو کا دلیہ یا چائے رس پر گزارہ ہے.....''اس نے بتایا.....میرا چمچ والا ہاتھ رک گیا.....

''کب سے؟''میں نے پوچھا۔

''یاد نہیں اب تو مدت ہی بیت گئی'' لہجے میں کوئی شکوہ نہ تھا لیکن میرا دل شکووں سے بھر گیا.....''کیا تھا یا الٰہی جو دنیا کی خوشیاں برتنے دیتا'' یہ شکوہ میں نے بلند آواز میں کیا جسے سنتے ہی وہ تڑپ اٹھی۔

''توبہ توبہ ایسی بات تو نہ کریں ..... ، یہ تو قادر کی تقدیر سے ناراضگی ہے ..... دنیا مجھ پر ترس کھاتی ہے کہ کیا ہوتا جو مالک ایک بچہ ہی میری گود میں دے دیتا میرا سہارا تو بنتا..... میں کہتی ہوں یہ رب کا فیصلہ ہے اور مجھے قبول ہے.....میں اس بیماری میں بچے کو کہاں سنبھال سکتی تھی؟ باپ کے بعد بچہ ماں سے بھی محروم ہو جاتا.....دنیا کی ٹھوکروں پر پلتا.....'' مجھے اس کی باتوں کی صداقت پر حیرانی تھی۔ اس کی عظمت کا جیسا انکشاف اب ہو رہا تھا پچھلے سولہ سالوں میں ایک دفعہ بھی نہ ہوا.....میں نے قطعیت سے کہا۔

''تم دلیہ کھاؤ ..... میں ایمبولینس کا بندوبست کرتا ہوں.....''رضیہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

''اب کیوں گونگے کا گڑ کھا لیا ہے'' میں نے ہنس کر پوچھا۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے اوندھی لیٹی تھی۔

''بی بی جی''.....کام والی بھاگی آئی''بی بی جی.....آپ کون ہیں جی؟.....آپ کو نہیں علم بی بی جی کے سر میں اچانک درد اٹھتا ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہیں اکثر تو انھیں نظر آنا بند ہو جاتا ہے.....''

مجھ کچھ نہیں سوجھا اندھا دھند ایمبولینس لانے دوڑا.....
میرا دل چیخ چیخ کر مجھ سے سوال کر رہا تھا۔ ''اگر رضیہ کو نظر آنا بند ہو گیا تو سلیم تم دنیا کو کیسے دیکھو گے؟''

☆☆☆

ہسپتال میں رضیہ کو شفٹ ہوئے چوتھا ہفتہ تھا..... میں نے اس کی دلجوئی، تیمارداری میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس کے گاؤں کے لوگ اس کی سہیلیاں، شاگرد، وقتاً فوقتاً آتی تھیں ان کے بقول مجھ جیسی تیمارداری کوئی نہیں کر سکتا اور یہ میں جانتا ہوں کہ جتنا کفارہ مجھے اپنی کوتاہیوں کا ادا کرنا ہے اس کی کوئی حد ہی نہیں.....

تمام ڈاکٹرز کے مشورہ سے اس کے دماغ کے آپریشن کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس کی بیہوشی کی مدت کبھی بھی اتنی لمبی نہ ہوئی تھی..... اڑوس پڑوس کی خواتین بتاتی تھیں کہ زیادہ سے زیادہ دو چار دن میں وہ ٹھیک ہو جایا کرتی تھی..... بہرحال آپریشن اس کے ہوش میں آنے تک ملتوی کر دیا تھا..... صورت حال تو میں سمجھ رہا تھا، میرے ساتھ سو فیصد یہی ہونا چاہیے تھا..... میں نے اپنے رویے سے اسے بیگانہ کیے رکھا۔ اب میں اسے کیسے ہوش میں لاؤں.....

میرے دونوں خالی ہاتھ پھر بادشاہ کے در پر پھیلے ہوئے تھے۔

☆☆☆

''سو میں سے صرف دس مریض ایسے ہوتے ہیں جن کے برین کو آپریٹ کیا جائے اور ان کے جسم کا کوئی حصہ متاثر نہ ہو، بالعموم بینائی چلی جاتی ہے، جسم کا ایک حصہ پیرالائز ہوتا ہے یا سننے بولنے کی حس پر اثر پڑتا ہے .....'' ہسپتال کے نیوروسرجن نے مجھے آگاہ کیا۔ ''اللہ کا شکر ہے آپ کی مسز ہوش میں آ رہی ہیں۔ ہم آپریشن میں تاخیر نہیں کریں گے.....''

میں سرتاپا دعا بن چکا تھا.....

وہ ہوش میں آ چکی تھی..... اس کی آنکھیں کھلیں..... اس کے ہونٹ ہلے..... میرے چاروں طرف زندگی ہنس رہی تھی۔

''رضیہ تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ..... ورنہ میں جیتے جی مر جاؤں گا.....'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لیا۔ ''یہ چار ہفتے میں نے اللہ سے ایک ہی دعا کی ہے..... اے اللہ مجھے رضیہ چاہیے..... محبتوں سے گندھی، برکتوں، رحمتوں والی رضیہ.....!!''

وہ دیر تک اپنے آنسو پونچھتی رہی۔

''گیارہ بج چکے ہیں، بارہ بجے ہم انھیں آپریشن تھیٹر لے جائیں گے۔'' سسٹر نے انٹری دی.....

اس کے جاتے ہی رضیہ نے دروازہ کی طرف اشارہ کیا..... دروازہ بند کر کے میں اس کے قریب آیا..... وہ سرگوشی کے انداز میں بولی ..... ''مجھے اپنی گزشتہ زندگی پر ذرہ بھر ندامت یا افسوس نہیں..... ٹھیک ہے نا تمام حسرتیں اور تمنائیں تھیں لیکن میرا ایمان تھا یہ میری تقدیر ہے..... میں نے بس یہی دعا مانگی اللہ آپ کے دل میں میرے لیے محبت پیدا کر دے۔ میرا پور پور اس کا شکر گزار ہے جس نے محبتوں کا بہتا سمندر میرے حوالے کر دیا..... میں لولی لنگڑی، اندھی بن کر

جینے سے کہیں بہتر یہ سمجھتی ہوں کہ بھرپور زندگی گزار کر جس میں اب آپ کی محبت شامل ہے..... یہاں سے چلی بھی جاؤں تو دکھ نہیں.....''

''لیکن مجھے تم کسی نقص کے ساتھ بھی ویسے ہی اچھی لگو گی جیسے اب.....!'' میں نے اس کی غلط فہمی دور کی۔ ''میں نے تمھارے وجود سے نہیں تمھارے کردار سے محبت کی ہے اور کردار کبھی اندھے بہرے ہو کر اپنی وقعت نہیں کھوتے..... میرا وعدہ ہے میری رضیہ.....'' میں نے اسکے ہاتھ پر بوسہ دیا.....

''میرا وعدہ ہے، مجھے یقین ہے تم ضرور کامیاب آپریشن کے ساتھ آؤ گی۔''

''ہم دونوں مل کر دنیا میں محبتیں بانٹیں گے خواہ وہ عرصہ دو گھنٹے کا ہو، دو سالوں کا ہو یا دو صدیوں کا، بس تم میری ہو.....!!''

وہ پھر مسکرا دی ..... اس کی مسکراہٹ نے کمرے میں چاروں طرف روشنیاں پھیلا دیں.....!!

''یہ بات میں جانتی ہوں آپ شاید اپنے آپ کو یہ یقین دلا رہے ہیں ..... یہاں نہیں تو اگلے جہاں میں اکٹھے رہیں گے یہ کافی نہیں؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''شاید.....'' میں نے کہا۔ آسن راس کی کیفیت میں صوفے کی بیک سے سر ٹکا دیا۔ کلاک کی گھڑیاں تیزی سے بارہ کے ہندسے کو چھونے والی تھیں.....

ہسپتال کا عملہ سٹریچر لے کر کمرے کے باہر پہنچ چکا ہے..... رضیہ کے چہرے پر محبتیں پا لینے کے بعد سکون ہی سکون ہے اور میرے دل میں اس کی زندگی کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

سٹریچر والے عملے سے اس نے پانچ منٹ کی مہلت مانگی..... دائیں ہاتھ میں تیمّم کی مٹی پکڑ کر اس سے تیمّم کیا۔

''دو نفل شکرانے کے پڑھنا چاہتی ہوں ..... اس رب کی شکر گزاری کے جس نے مجھے اپنی اور آپ کی محبتوں سے مالا مال کیا۔ محبت کو زمان و مکان سے نہیں ناپتے ..... محبت ایک لمحے کی ملے یا ایک صدی کی ..... کائنات کا بھرپور خزانہ ہے۔''

نوافل کی ادائیگی میں اس کے چہرے پر حد درجہ الوہیت تھی ..... انوکھی چمک ..... میں اس کا خشوع و خضوع دیکھ کر دنگ رہ گیا..... میں نے اپنے آپ سے کہا۔

سلیم ..... یہ ہے وہ واحد رشتہ یہ واحد تعلق جس نے زندگی کی ہر آزمائش کے پل صراط سے آسانی سے گزرا دیا اور تمھارے پاس جب تک یہ کیفیت اور تعلق نہ تھا تم نفس کے غلام بنے رہے..... اب اسی فرشتہ صفت عورت کی دعاؤں نے تمھیں اسی ہستی سے آشنا کروایا تو تمھیں ہر چیز میں حلاوت ملنے لگی ہے.....

یہی حلاوت اللہ نے ایمان والوں کو دنیا میں تحفتاً دی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ہر مصیبت کے پہاڑ سے سر ٹکرا لیتے ہیں۔

یہی وہ حلاوت ہے جو فرعون کے جادوگروں کو سجدہ میں لمحہ بھر کے لیے ملی اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئے ..... نوافل کے بعد اس کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے۔

''ایک منٹ .....'' میں نے اسے دعا مانگنے سے روکتے ہوئے کہا۔

''آج تمھاری دعاؤں میں یہ دعا تو نہیں ہے ناں کہ اے اللہ سلیم کے دل میں میری محبت ڈال دے.....''

آنکھ سے ٹپکا آنسو پونچھتے ہوئے اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اس کا اقرار اس وقت کائنات کی سب سے بڑی خوبصورتی لیے ہوئے تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کی پشت کو اپنی آنکھوں سے لگایا اور اسے اللہ کے سپرد کر دیا۔ اگر میرا اللہ، ایوبؑ کا رب اسے صحت کے ساتھ واپس لے آیا تو وہ رضیہ نہیں میری ملکہ رضیہ سلطانہ ہوگی ..... میرا ہر سانس اس سے کی گئی زیادتیوں کی تلافی اور رب سے معافی کا ہوگا.....اور اگر میری ماہتاب زمین کے نیچے چھپ گئی.....اس عارضی دنیا سے کنارہ کر لیا تو.....اس کی یہ جدائی، اس کے بغیر زندگی گزارنے کا حوصلہ میری گزشتہ زندگی میں کیے گئے اعمال کا نتیجہ ہوگی ..... لیکن یہ کیا کم ہے کہ رب کی معرفت کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھوانے والی کی محبت اور مغفرت کی دعا دونوں میری زندگی کی تنہائیوں میں میری ساتھی رہیں گی.....میں رب کے ہر فیصلے پر راضی ہوں۔

حضرت زینبؓ بنتِ رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ حضرت محمدؐ، سرورِ کائنات خاتم النبین رحمت اللعالمین کی سب سے بڑی صاحبزادی کا نام زینبؓ تھا۔ آپؓ کی والدہ ماجدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ تھیں جو حضورؐ کی پہلی زوجہ محترمہ تھیں۔ سب سے پہلے اسلام کی تصدیق کرنے والی یہی بے مثال خاتون تھیں۔

حضرت زینبؓ بعث نبوی سے دس سال قبل پیدا ہوئیں۔ جب آپ کی پیدائش ہوئی اس وقت رسول اللہؐ کی عمر ۳۰ برس تھی۔

حضرت زینبؓ کے بارے میں حضرت عائشہؓ رسولؐ کا یہ ارشاد نقل کرتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ''زینب میری سب سے اچھی بیٹی ہے جو میری محبت میں ستائی گئی۔'' (حاکم و زرقانی شرح مواہب)

بچپن:

جب آپؐ کی عمر چالیس برس کی ہوئی تو آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے مرتبۂ نبوت پر سرفراز فرمایا۔ آپؐ نے مشرکین مکہ کو اسلام کی دعوت دی تو وہ آپؐ کے دشمن بن گئے اور آپؐ پر طرح طرح کے ظلم ڈھانے لگے آپؐ کی راہ میں کانٹے بچھاتے۔ آپؐ پر کوڑا کرکٹ پھینکتے، پتھر برساتے۔ کبھی آپؐ کے گلے میں چادر لپیٹ کر آپؐ کا دم گھونٹنے کی کوشش کرتے۔ سیدہ زینبؓ اگرچہ صرف دس برس کی تھیں مگر کفار کے ہاتھوں اپنے بابا جان پر ظلم وستم ہوتا دیکھتیں تو بے چین ہو جاتیں۔

حضرت مدرک بن حارثؓ بیان کرتے ہیں ایک بار ایام جاہلیت میں میں اپنے باپ کے ساتھ حج کو گیا تو مقام منیٰ میں ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے گرد لوگ جمع ہیں۔ میں نے اپنے والد سے پوچھا بابا! یہ کون شخص ہے؟ انھوں نے کہا یہ وہی گمراہ اور بے دین شخص محمدؐ ہے جس نے اپنے خاندانی دین کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ کہہ کر میرے والد اس مجمع کی طرف گئے اور میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ وہاں جا کر میں نے دیکھا کہ حضورؐ لوگوں کو نصیحت فرما رہے ہیں اور وہ لوگ حضورؐ پر پتھر برسا رہے ہیں اور خاک ڈال رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ظالم ایذا رسانی کرتے کرتے تھک گئے اور دھوپ کی تپش سے گھبرا کر ہٹ گئے عین اسی وقت ایک خوبصورت لڑکی بے قراری کے ساتھ دوڑی ہوئی آئی جس کے ہاتھ میں پانی کا ایک پیالہ تھا۔ اس نے پانی کا پیالہ رسولؐ کی جانب بڑھایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس وقت لوگوں نے بتایا یہ محمدؐ کی لڑکی ہے اور اس کا نام زینبؓ ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ اے میری بیٹی تو کیوں اس قدر پریشان ہوتی ہے۔ بیٹی تو اپنے باپ کے خدا کی راہ میں مغلوب و ذلیل ہونے کا اندیشہ بالکل نہ کر۔ (بنات الرسول، ص ۱۰)

نکاح:

حضرت خدیجہؓ کی ایک بہن کا نام ہالہؓ تھا یہ حضرت خدیجہؓ کی سگی بہن تھیں۔ انھیں حضرت زینبؓ اپنے شائستہ اطوار و خصائل، پیاری گفتگو اور پسندیدہ صورت و سیرت کی وجہ سے بہت محبوب تھیں۔ بہت ہی کم سنی میں انھوں نے اپنے بیٹے ابو العاص سے زینبؓ کا رشتہ طے کر دیا اور یوں باہم مشاورت کے بعد بعثت نبوی سے قبل ہی ابوالعاص سے ان کا نکاح ہو گیا تھا۔ شادی کے موقع پر حضرت خدیجہؓ نے دوسری چیزوں کے علاوہ عقیق کا ایک بیش قیمت یمنی ہار بھی دیا جو آخر وقت تک ان کے پاس ماں کی نشانی کے طور پر رہا۔ (اسد الغابہ، جلد۴)

اسلام:

جب آنحضرتؐ نبوت پر فائز ہوئے تو حضرت زینبؓ فوراً اسلام لے آئیں۔

عام حالات:

حضرت زینبؓ تو فوراً اسلام لے آئی تھیں مگر ابوالعاص اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی انھیں حضورؐ نے زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا تھا تاہم آنحضرتؐ کی ابوالعاص کے بارے میں بہت اچھی رائے تھی ابوالعاص کو کفار نے بہت اکسایا کہ وہ حضرت زینبؓ کو طلاق دے دیں لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا اور حضرت زینبؓ سے نہایت اچھا سلوک کرتے رہے۔ رسولؐ نے ابوالعاص کے اس طرزِ عمل کی ہمیشہ تعریف کی۔ آپؐ نے فرمایا ''ابوالعاص ایک انصاف پسند شخص اور ہمارے اچھے داماد ہیں۔'' (طبری، جلد اول)

باوجود اتنی شرافت اور نیک نفسی کے ابوالعاص نے اسلام قبول نہ کیا یہاں تک کہ آنحضرتؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔ حضرت زینبؓ ان دنوں اپنے سسرال میں تھیں۔ آپؐ کو ابوالعاص کی نیک نیتی پر اتنا اعتماد تھا کہ آپؐ نے ہجرت کے وقت اپنی جگر گوشہ زینبؓ کو ابوالعاص کے پاس ہی رہنے دیا۔

۲ ہجری جنگ بدر:

رمضان المبارک میں حق اور باطل کے درمیان پہلا معرکہ بدر کے میدان میں ہوا اس میں حق غالب رہا اور قریش مکہ کے بہت سے آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے ان میں ابوالعاص بھی تھے۔ ابوالعاص کو عبداللہ بن جبیرؓ انصاری نے گرفتار کیا۔

گرفتاریوں کی خبر اہل مکہ کو پہنچی تو اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیہ بھیجا۔ حضرت زینبؓ نے بھی اپنے دیور عمر بن ربیع کو وہ بیش قیمت یمنی عقیق کا ہار دے کر بھیجا جو ان کی والدہ نے انھیں شادی کے موقع پر دیا تھا۔ یہ ہار ان کو دل و جان سے عزیز ہوگا کیونکہ ان کی والدہ کی نشانی تھا مگر اپنے شوہر کی محبت میں وہ سب کچھ قربان کر سکتی تھیں اس واقعہ سے ان دونوں کی محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جب یہ ہار آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپؐ نے اپنی مرحومہ بیوی کی نشانی کو فوراً پہچان لیا اور آپؐ فرطِ غم سے بیتاب ہو گئے اور چشم مبارک سے آنسو بہہ نکلے اور خدیجہؓ کی یاد تازہ ہو گئی۔

آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا ''اگر مناسب سمجھو تو یہ ہار زینبؓ کو واپس کر دو یہ اس کی ماں کی نشانی ہے۔ ابوالعاص کا فدیہ صرف یہ ہے کہ وہ مکہ جا کر حضرت زینبؓ کو فوراً مدینہ بھیج دیں۔ تمام صحابہؓ یک زبان ہو کر بولے، ''یا رسول اللہ ہم لوگ آپؐ کے فیصلے سے راضی ہیں۔'' (سیرت ابن ہشام)

حضرت زینبؓ کو لانے کے لیے ابوالعاص کے ہمراہ حضرت زید بن حارثہؓ کو روانہ کیا گیا اور ہدایت کی کہ تم بطن یاجج میں ٹھہر کر انتظار کرنا جب حضرت زینبؓ وہاں آ جائیں تو انھیں لے کر مدینہ منورہ آ جانا۔

ابوالعاص نے مکہ معظّمہ پہنچ کر حضرت زینب کو اپنے چھوٹے بھائی کنانہ کے ساتھ مدینہ منورہ جانے کی اجازت دے دی۔

حضرت زینبؓ جب سامان سفر کی تیاری میں مشغول تھیں تو ہند بن عتبہ آپ کے پاس آئیں اور کہا اے بنت محمدؐ کیا تم اپنے باپ کے پاس جا رہی ہو؟ حضرت زینبؓ نے مصلحتاً یہ فرمایا فی الحال تو ایسا کوئی ارادہ نہیں آگے جو اللہ کے منظور ہو۔ ہند نے کہا۔ بہن اس میں پوشیدگی کی کیا ضرورت ہے اگر تم واقعی جا رہی ہو اور کچھ زادِراہ کی ضرورت ہے تو بلا تکلف مجھے بتا دو میں ہر طرح کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ حضرت زینبؓ فرماتی ہیں کہ ہند جو کچھ کہہ رہی تھیں وہ سچے دل سے کہہ رہی تھیں یعنی اگر مجھے کچھ چاہیے ہوتا تو وہ ضرور میری مدد کرتیں لیکن وقت کی مصلحت سے انکار کر دیا۔ (سیرت ابن ہشام)

اس واقعہ سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ابھی خواتین میں وہ نفرت اور عداوت کا زہر پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔

تیاری کے بعد زینبؓ اپنے دیور کنانہ کے ہمراہ اونٹ پر سوار ہو کر روانہ ہوئیں۔ چونکہ کفار کا غلبہ تھا اور ان کے تعرض کا خوف تھا اس لیے آپ کے دیور نے اپنے ساتھ ترکش اور تیر بھی رکھ لیے۔ جب یہ لوگ چل پڑے تو قریش میں کھلبلی مچ گئی اور گرفتاری کے لیے سوچ بچار شروع ہو گئی اور فوری طور پر ایک جماعت ان کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی اور مقام ''ذی طویٰ'' میں انھیں جا گھیرا۔ حضرت زینبؓ اونٹ پر سوار تھیں کفار کی جماعت میں سے ہبار بن اسود نے حضرت زینبؓ کو اپنے نیزہ سے زمین پر گرا دیا، حضرت زینبؓ اونٹ سے ایک چٹان پر گر پڑیں اور بے ہوش ہو گئیں۔ وہ حاملہ تھیں ان کا حمل ساقط ہو گیا چوٹ بہت زیادہ آئی۔ اس پر کنانہ نے ترکش سے تیر نکالا اور کہا اب جو کوئی میرے قریب آئے گا وہ ان تیروں کا نشانہ بنے گا۔ ابوسفیان سردارانِ قریش کے ساتھ آگے بڑھا اور کہا تیر ترکش میں ڈال لو ہم تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔

کنانہ نے ایسا ہی کیا۔ ابوسفیان نے کنانہ کے کان میں کہا محمدؐ کے ہاتھوں ہمیں جس رسوائی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تم اس سے بخوبی آگاہ ہو اگر ان کی بیٹی کو اس طرح سرعام ہمارے سامنے لے جاؤ گے تو ہماری بہت سبکی ہو گی اس وقت تم زینبؓ کو واپس لے جاؤ پھر کسی روز خفیہ طور پر زینبؓ کو مدینے لے جانا۔ کنانہ نے اس کی بات مان لی اور وہ دونوں واپس مکہ آ گئے۔

حضرت زینبؓ بھی زخمی تھیں ان کی طبیعت بھی کافی

خراب تھی چند روز کے بعد جب حالت کچھ بہتر ہوئی تو چپکے سے کنانہ کے ہمراہ روانہ ہوئیں اور بطن پہنچ گئیں جہاں کنانہ نے انھیں حضرت زید بن حارثہ کے سپرد کیا اور وہ انھیں لے کر مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔(زرقانی)

حضرت ابوالعاص کو حضرت زینبؓ سے بہت محبت تھی دونوں کے تعلقات، اتحاد و ارتباط بہت خوشگوار تھے۔ جب حضرت زینبؓ مدینہ منورہ تشریف لے گئیں تو ابوالعاص بہت مغموم رہنے لگے۔ ایک مرتبہ شام کے سفر میں حضرت زینبؓ بہت یاد آئیں تو انھوں نے یہ دو شعر پڑھے جس کا ترجمہ یہ ہے ؎

''جب میں ارم کے مقام سے گزرا تو زینب کو یاد کیا، اور کہا خدا اس شخص کو شاداب رکھے جو حرم میں مقیم ہے، امین کی لڑکی کو خدا جزائے خیر دے، اور ہر خاوند اسی بات کی تعریف کرتا ہے جس کو وہ خوب جانتا ہے۔'' (طبقات)

ابوالعاص کو تجارت کا بہت اچھا تجربہ تھا۔ وہ امانت داری میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ لوگ ان کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے تھے۔ اہل قریش اپنا تجارتی مال ان کو دے کر دوسرے ملکوں میں فروخت کے لیے بھیجا کرتے۔ ۶ ہجری میں ابوالعاص قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوئے۔ عیص کے مقام پر مجاہدین اسلام نے قافلے پر چھاپا مارا اور تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ حضرت ابوالعاص بھاگ کر مدینہ چلے گئے اور دوسرے مشرکین کو مسلمانوں نے گرفتار کر لیا۔ حضرت ابوالعاص نے مدینہ پہنچ کر حضرت زینبؓ کی پناہ لی۔ حضرت محمدؐ نماز فجر میں مشغول تھے کہ حضرت زینبؓ نے با آواز بلند فرمایا میں نے ابوالعاص کو پناہ میں لے لیا ہے۔

جب آنحضرتؐ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا ''اے لوگو! تم نے کچھ سنا'' سب نے عرض کیا ''جی ہاں سنا''۔ آپؐ نے فرمایا ''مجھے اس سے قبل اس واقعہ کی کچھ اطلاع نہ تھی۔'' جب آپؐ گھر تشریف لائے تو حضرت زینبؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا۔ ابوالعاص کا مال و متاع واپس دلوایا جائے چونکہ ابوالعاص مکہ میں حضرت زینب کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کرتے تھے۔ اس لیے حضورؐ نے ان کا لحاظ کیا اور صحابہؓ سے فرمایا۔ اگر تم ابوالعاص کا مال واپس کر دو گے تو میں ممنون احسان ہوں گا۔

صحابہ کرامؓ کو تو حضورؐ کی خوشنودی چاہیے ہوتی تھی فوراً تمام مال اسباب واپس کر دیا۔

آپؐ نے حضرت زینبؓ سے کہا ابوالعاص کی خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ کرنا مگر آپس میں قرابت نہ بڑھانا کیونکہ اسلام اور کفر دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

اس کے بعد ابوالعاص اپنا مال و متاع لے کر مکہ پہنچے اور تمام لوگوں کی امانتیں واپس کر دیں۔ پھر اہل مکہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ سن لو میں مسلمان ہوتا ہوں خدا کی قسم مجھے اسلام قبول کرنے میں یہ امر مانع تھا کہ تم لوگ مجھے خائن نہ سمجھو۔ یہ کہہ کر کلمہ شہادت پڑھا اور مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ واقعہ محرم ۷ ہجری کا ہے۔ (طبقات)

جب ابوالعاصؓ مشرف بہ اسلام ہو کر مکہ سے مدینہ پہنچے تو آپؐ نے زینبؓ کو بقعد اول یعنی پہلے حق مہر پر ہی ان کے شوہر کی طرف رجوع کرا دیا۔ اس وقت سورۃ برأت نازل نہیں ہوئی تھی۔ یوں ابوالعاصؓ مستقل مدینے میں رہائش پذیر ہو گئے۔

لباس:

حضرت زینبؓ قیمتی کپڑے پہننے کی شائق تھیں۔ حضرت انسؓ نے انھیں ریشمی چادر اوڑھے دیکھا ہے جس پر زرد رنگ کی دھاریاں تھیں۔

اولاد:

حضرت ابوالعاص کے صلب سے حضرت زینب کے دو بچے پیدا ہوئے ایک فرزند علیؓ اور دختر امامہؓ۔ علی ہجرت سے قبل پیدا ہوئے۔ آپؐ نے ان کو اپنی کفالت میں لے لیا اور یوں علی بن العاص آپؐ کے سایۂ عاطفت میں تربیت پاتے رہے۔ فتح مکہ کے موقع پر جب حضورؐ مکہ میں داخل ہوئے۔ علیؓ بن العاصؓ آپؐ کے اونٹ پر سوار تھے۔ ایک روایت ہے سن بلوغ سے قبل اپنے والد ابوالعاصؓ کی زندگی میں ہی وفات پا گئے۔ ابن عاسکر کی روایت کے مطابق جنگ یرموک میں علیؓ نے جام شہادت نوش فرمایا۔

حضرت زینبؓ کی صاحبزادی کا نام امامہؓ تھا۔ ان سے آنحضرتؐ کو جو محبت تھی وہ کم خوش نصیبوں کے حصہ میں آئی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضورؐ اپنی تمام نواسیوں میں سے امامہؓ سے سب سے زیادہ محبت کرتے تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ اور کیوں نہ پیار کرتے پیاری بیٹی کی پیاری اولاد تھیں۔ ایک بار حضورؐ نماز پڑھنے جا رہے تھے کہ کہیں سے امامہؓ نے نانا جان کو دیکھ لیا ابھی اتنی کم سن تھیں کہ دوڑ کر نانا جان کے پاس نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ پھر بھی جذبۂ محبت میں سرشار معصومانہ انداز میں گرتے پڑتے نانا جان کے پاس پہنچ گئیں۔ حضورؐ نے نواسی کی بیتابانہ محبت دیکھی تو آپؐ نے ان کو کندھے پر بٹھا لیا اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ اسی حالت میں ان کو پکڑے ہوئے رکوع میں گئے لیکن سجدے میں دشواری ہوئی اس لیے بچی کو آہستہ سے زمین پر بٹھایا سجدے کے بعد پھر ان کو گود میں لے کر کھڑے ہوئے اور پوری نماز اسی طرح ادا فرمائی۔ (بخاری، کتاب الصلوٰۃ)

ایک بار کسی نے آنحضرتؐ کی خدمت میں تحفہ بھیجا جس میں سونے کا ایک ہار بھی تھا۔ آپؐ نے فرمایا میں ہار اسے دوں گا جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ ازواجِ مطہرات نے سمجھا کہ یہ ہار حضرت عائشہؓ کو ملے گا لیکن آپؐ نے حضرت امامہؓ کو بلایا اور ہار ان کے گلے میں ڈال دیا۔ (مسند احمد)

اسی طرح حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے بارگاہِ رسالت میں کچھ تحفے روانہ کیے۔ جس میں ایک سونے کی انگوٹھی تھی۔ آپؐ نے وہ انگوٹھی حضرت امامہؓ کو پہنا کر فرمایا۔ بیٹی! یہ زیور ہے اس کو پہن لے۔ (استیعاب)

طبقات الکبریٰ میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا **احب اھلی الی** ۔ میرے اہل بیت میں امامہؓ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ (ابن سعد)

حضرت امامہؓ جب سن شعور کو پہنچیں تو ان کا نکاح حضرت فاطمہؓ کی وصیت کے مطابق حضرت علیؓ سے ہوا۔ بعض روایات میں ہے حضرت زبیر بن عوام جو ان کے سرپرست تھے ان کے ایما پر وہ حضرت علیؓ کے عقد میں آئیں پھر حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد مغیرہ بن نوفلؓ سے ہوا۔

وفات:

حضرت زینبؓ حضرت ابوالعاص کے ایمان لانے کے تقریباً سال سوا سال تک زندہ رہیں۔ رسولؐ کی حیاتِ مبارکہ

میں ۸ ہجری میں راہگرائے فردوس ہوئیں۔

حضرت زینبؓ کی وفات کا حال استیعاب میں لکھا ہے۔

''جب سے وہ ہجرت کے موقع پر اونٹنی سے گری تھیں اور ان کو جو چوٹیں آئی تھیں، ان کی تکالیف کا سلسلہ آخری سانسوں تک باقی رہا، یہاں تک کہ آپؓ نے ۸ ہجری میں وفات پائی۔''

حضرت زینبؓ کی رحلت کے بعد ان کے شوہر ابوالعاصؓ بھی زیادہ دیر تک زندہ نہ رہے۔ آخر ۱۲ ہجری میں ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ (اسدالبالغہ)

حضرت ام ایمنؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت ام سلمہؓ نے رسولؐ کی ہدایت کے مطابق میت کو غسل دیا۔ جب غسل سے فارغ ہوئیں تو حضورؐ کو اطلاع دی۔ آپؐ نے اپنا تہہ بند عنایت فرمایا اور ہدایت کی کہ اسے کفن کے اندر پہنا دو۔

ام عطیہؓ سے روایت ہے کہ میں بنتِ رسولؐ کے غسل میں شریک تھی۔ غسل کا طریقہ، حضورؐ خود بتاتے جاتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا پہلے ہر عضو کو تین بار یا پانچ بار غسل دو۔ اس کے بعد کافور لگاؤ۔ آپؐ نے فرمایا۔

''اے ام عطیہ میری بیٹی کو اچھی طرح کفن میں لپیٹنا اس کے بالوں کی تین چوٹیاں بنانا اور اسے بہترین خوشبوؤں سے معطر کرنا۔''

نمازِ جنازہ خود حضورؐ نے پڑھائی۔ ابوالعاصؓ نے انھیں قبر میں اتارا۔ حضورؐ خود بھی قبر میں اترے۔

جس دن حضرت زینبؓ نے وفات پائی۔ حضورؐ بے حد مغموم تھے۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی۔

''اے خدا! تو زینب کی مشکلات کو آسان کر دے اور اس کی قبر کی تنگی کو کشادگی سے بدل دے۔'' (اسدالغالبہ)

رضی اللہ عنہا ورضا ھا۔

(اس مضمون کی تیاری کے لیے تذکار صحابیات، صحابیات، تاجدار مدینہ کی شہزادیاں سے استفادہ کیا گیا)

❁❁❁

تبسم زیرِ لب

ہمیں غصہ ان حضرات پر آتا ہے جو بے سوچے سمجھے یہاں کے موسم پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور اس کی وضاحت نہیں فرماتے کہ انھیں کون سا موسم ناپسند ہے۔ کراچی میں موسم ہر لحظہ روئی کے بھاؤ کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ ہم نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ ایک ہی عمارت کے کرایہ دار ایک منزل سے دوسری منزل پر تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے جاتے ہیں۔ یہاں آپ دسمبر میں ململ کا کرتہ یا جون میں گرم پتلون پہن کر نکل جائیں تو کسی کو ترس نہیں آئے گا۔ ہوتا یہ ہے کہ اچھے خاصے لحاف اوڑھ کر سوئے اور صبح پنکھا جھلتے ہوئے اٹھے۔ یا محکمہ موسمیات کی پیش گوئی کو ملحوظ رکھتے ہوئے صبح برساتی لے کر گھر سے نکلے اور دوپہر تک لو لگنے کے سبب بالا ہی بالا اسپتال میں داخل کرا دیے گئے۔ کہاں تو رات کو ایسی شفاف چاندنی چٹکی ہوئی تھی کہ چارپائی کی چولوں کے کھٹمل گن لیجیے اور کہاں صبح دس بجے یہ عالم کہ ہر بس، ہیڈ لائٹ جلائے اوس سے بھیگی سڑک پر خربوزے کی پھانک کی طرح پھسل رہی ہے۔ موسم کے تلون کی یہ کیفیت ہے کہ دن بھر کے تھکے ہارے پھیری والے شام کو گھر لوٹتے ہیں تو بغیر استخارہ کے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ صبح اٹھ کر بھوبل کی بھنی گرما گرم مونگ پھلی بیچیں یا آئس کریم! (چراغ تلے، از مشتاق احمد یوسفی)

مونالیزا کا سنا تھا اور اسی کی تلاش تھی۔ صاحبو! پروپیگنڈا بڑی چیز ہے۔ ہم نے بہت چھوٹی عمر میں، دس بارہ سال کے سن میں پہلی بار مونالیزا کا ذکر پڑھا تھا اور اس کی تصویر ''نیرنگ خیال'' کے سالنامے میں دیکھی تھی۔ جو کچھ نقاد کرام نے مونا لیزا کی مسکراہٹ کے باب میں لکھا تھا، اسے پڑھ کر تو ہم متاثر ہوئے لیکن تصویر دیکھ کر نہیں۔ سینکڑوں بار یہ تصویر دیکھی اور آخر خیال کیا کہ یہ نقلیں ہیں، اصل میں ضرور کوئی بات ہوگی۔ پس ہم 'لوور' میں اسٹیٹ روم میں پہنچے تو دم بخود تھے۔ ایک تصویر کے سامنے لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہم نے اسے دور سے دیکھا، پاس سے دیکھا۔ بہت جی کڑا کیا۔ لیکن صاحبو! آپ لوگوں نے بھی یہ تصویر دیکھی ہے، اس میں کون سی خاص بات ہے۔ ایک چہرہ ہے جس پر کسی طرح کے جذبات نہیں۔ کسی طرح کی شوخی، غم کی کیفیت نہیں اور ایک مسکراہٹ یا نیم مسکراہٹ ہے جو آپ کسی بھی غبی شخص کے چہرے پر دیکھ سکتے ہیں۔ ایک بار کسی نے اسے چڑھا دیا۔ باقی لوگ تقلیداً مکھی پر مکھی مارتے گئے۔ اگر کسی کی رائے ایسی ہوئی جیسی ہماری ہے تو مروت کے مارے یا نقادوں کے ڈر سے چپ ہو گیا کہ بدذوقی کی تہمت نہ اٹھائے۔ مونالیزا کے دلدادگان ہم پر نفرین بھیجنے سے پہلے ازراہِ انصاف اس تصویر کو ایک نظر دیکھ لیں اور ایک بے ڈول،

غبی چہرے پر اس احمقانہ تاثر کو ملاحظہ فرمائیں جو مسکراہٹ بنتے بنتے رہ گیا ہے۔ پھر جو جی چاہے ہمارے بارے میں کہیں۔

(’دنیا گول ہے‘، از ابن انشاء)

ٹیگور نے کہا تھا ہر نیا پیدا ہونے والا بچہ یہ پیغام لے کر آتا ہے کہ ابھی خدا انسان سے مایوس نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح ہر نئے مہینے کی پہلی تاریخ یہ پیغام لے کر آتی ہے کہ ابھی بیوی اپنے شوہر سے مایوس نہیں ہوئی ہے۔

تنخواہ کا دن وہ بیرومیٹر ہے جو بیگمات کے مزاج کا تعیین کرتا ہے۔ اس کے مطابق ان کے موڈ میں کمی بیشی کے آثار نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ بظاہر شوہر کو اس روز گھر میں وی آئی پی کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ پہلے عظیم الشان ہفتے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس رات دسترخوان کسی مشہور برانڈ کے مصالحے کے اشتہار کا منظر پیش کرتا ہے۔ دوسرے دن کا ناشتہ بھی پروٹین اور وٹامن سے بھرپور ہوتا ہے۔

روپے کی گرمی کے زیر اثر تعلقات میں بھی ایک ہفتہ تک گرمجوشی برقرار رہتی ہے۔ آج کل ہفتے منانے کا رواج ہے۔ اس ہفتے کو خانگی تعلقات میں ’’ہفتہ دل لگی‘‘ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

پھر جوں جوں روپے کی گرمی ماند پڑتی ہے، خانگی تعلقات ٹھنڈے پڑنے لگتے ہیں۔ اسی ٹھنڈک کے نتیجے میں ایک طرف دسترخوان سکڑتا ہے تو دوسری طرف بیگم کے ابرو۔ اب شوہر نامدار کی مقبولیت کا گراف روبہ زوال ہوتا ہے۔ گھر میں اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس ہفتے کو ’’ہفتہ بے رخی‘‘ کا نام دیا جاسکتا ہے۔

جیسے ہی تیسرا ہفتہ شروع ہوتا ہے سرحدی جھڑپوں کا آغاز ہوجاتا ہے۔ اب شوہر نامدار کو کھانے سے زیادہ جھڑکیاں ملتی ہیں یا ڈائٹنگ کے مشورے۔ اس ہفتے کو ’’ہفتہ ترش روئی‘‘ کہا جاسکتا ہے۔

اب ہر لمحے شوہر کی مظلومیت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ بیگم کے طعنے تشنوں اور لعنت ملامت کے آگے اس کے کان سن ہوجاتے ہیں اور زبان گنگ۔ پھر جیسے ہی وقت کا قافلہ چوتھے ’’جھڑکی توڑ‘‘ ہفتے میں داخل ہوتا ہے، تنخواہ والے گھروں میں کھلم کھلا محاذ آرائی کا سماں ہوتا ہے۔

(’تیرے کھیسے میں ’’پے‘‘ باقی نہیں ہے‘ از ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی)

❁❁❁

جو لگائے نہ لگے.....!!

سنا یہ ہے محبت کہکشاں ہے
یہ ہے فردوس، یہ جنت نشاں ہے
محبت گیت ہے، خوشبو ہے جھرنا
محبت ساز ہے چشمہ ہے ندیا
محبت رنگ ہے قوسِ قزح ہے
محبت بانسری ہے، سر ہے نغمہ
محبت پھول ہے بادل ہے بارش
محبت عہد ہے، لمحہ ہے، ساعت
محبت دلکشی ہے، چاندنی ہے
محبت تازگی ہے! زندگی ہے!

محبت ایک ایسا دروازہ ہے کہ جس کے اندر آپ داخل ہو جائیں تو باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ محبت ایک ایسا طلسم کدہ ہے کہ آپ اس کے فسوں میں کھو جاتے ہیں۔ ہر قدم ایک حیرانی آپ کے استقبال کو کھڑی ملتی ہے۔ آپ متحیر اور سحر زدہ رہ جاتے ہیں۔ ایسا سحر!! (دیکھا نہیں تھا کبھی ہم نے یہ سماں کیسا نشہ تیرے پیار نے کیا! کھو گئے سپنوں میں ہم!) محبت آپ کو سپنے دکھاتی ہے، تعبیر کے لیے بیکل رکھتی ہے۔ محبت ایک ایسا مقناطیسی میدان ہے کہ ہر خاص و عام اس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ ایک ایسی آگ جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ محبت کرنے والے اپنے پیچھے ایسی کہانیاں چھوڑ گئے ہیں کہ سب کا جی چاہتا ہے کہ اس کوچے میں قدم رکھ کر ایک بار تو دیکھیں! اس دیوار کے پار ایک بار تو جھانک لیں! اس دریا کو ایک بار تو عبور کر لیں! اس آگ کو ایک بار تو چھو لیں! (لگے تو لگاؤ گوری، پریت کا الاؤ گوری.....ابھی نہ بجھاؤ گوری..... ابھی سے بجھاؤ نہ)

زندگی میں محبت کا اس قدر پرچار اور اشتہار ہے کہ یہ زندگی کے لیے لازم و ملزوم لگتی ہے۔ کہانیوں میں، افسانوں میں، نصابوں میں، کتابوں میں، ڈراموں میں، فلموں میں، ناولوں میں، ڈائجسٹوں میں، غزلوں میں، گیتوں میں، محلوں میں، درباروں میں، بستیوں میں، بازاروں میں، شہروں میں دیہاتوں میں.....محبت ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ ہر شے محبت کے محور پر گھومتی نظر آتی ہے۔ تمام اچھائیاں ..... تمام برائیاں.....تمام سازشیں.....تمام منصوبے.....تمام تخت و تاج.....تمام تختہ و دار.....

آپ کو میٹرک کی سند اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک آپ میٹرک نہ کر لیں اور میٹرک آپ اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک میر کی غزلیں نہ پڑھ لیں، اور میر کی غزلیں آپ اس وقت تک نہیں پڑھ سکتے جب تک محبت اور اس کے

سوز و گداز، اس کے اسرار و رموز سے متعارف نہ ہو جائیں۔ (سوا گر تمام کھڑکیاں، دروازے، ٹی وی، فلمیں، رسائل اور ناولیں بند کر دی جائیں تب بھی میر و غالب کی غزلیں محبت کا چہرہ کرا ہی دیتی ہیں) ہیر رانجھا، سسی پنوں، عمر ماروی، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، تاریخ کے وہ کردار ہیں جو سب کو زبانی یاد ہیں۔ محبت کے ان کرداروں کو تاریخ نے امر کر دیا ہے۔ اس لیے محبت کرنا کوئی عظیم کارنامہ انجام دینے کے مترادف لگتا ہے۔ چنانچہ اسکول میں اگر مخلوط تعلیمی نظام رائج ہو تو محبت کی داغ بیل یہیں پڑ جاتی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو کوچنگ سنٹرز میں یہ سہولت بسہولت دستیاب ہے اور اسے ہوا دینے کے لیے نیٹ، چیٹ، موبائل شوبائل موجود ہیں گویا رسم دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، روشن خیالی بھی ہے۔

وہ محبت جو پہلے شعراء کے دیوانوں، ناول نگاروں کے ناولوں، فلم پروڈیوسروں کی فلموں، ڈرامہ نگاروں کے ڈراموں اور مغلیہ شہنشاہوں اور شہزادوں کے محلات تک محدود اور مقید تھی ایسی آزاد اور بے لگام ہوئی کہ گلی گلی کسی یاد کی طرح بچھ گئی..... کہ پیاروں کے لیے اس سے بچ کر چلنا مشکل ہو گیا۔ ہر رہگذر میں محبت سے جو مڈبھیڑ ہونے لگی، بھلا اس سے کنی کترا کے، دامن چھڑا کے بچ بچا کے کیسے نکلا جا سکتا ہے؟ آگے بڑھا جا سکتا ہے؟ چنانچہ جو بھی بیگانہ علم تھے، غم آشنا ہوئے۔ نصابِ زندگی میں محبت ایک لازمی مضمون کا درجہ اختیار کر گئی۔ محبت کے بغیر زندہ رہنا بالکل احمقانہ، دقیانوسی، ان کلچرڈ سمجھا جانے لگا۔ (بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہر کوئی تو محبت کی پھواروں میں بھیگ رہا ہے اور ہم حالات کے الاؤ میں جل رہے ہیں! ہر کوئی اس کے خمار میں ڈوبا ہوا ہے ہم ہیں کہ تا حال بقائم ہوش و حواس ہیں! ہر کوئی کسی کے ساتھ گھوم رہا ہے ہم ہیں کہ اکیلے ہی دشت پیمائی کر رہے ہیں!) چنانچہ محبت ہر کس و ناکس، ہر امیر و غریب، ہر صاحب و بندہ و محتاج و غنی کے لیے ناگزیر ہو گئی۔ شہروں، دیہاتوں، گاؤں، قصبوں، میدانی، پہاڑی، بارانی علاقوں میں داخل ہو گئی جیسے سیلابی ریلا داخل ہوتا ہے۔ محبت کے پروانے ہر جگہ یوں چھا گئے جیسے مارکیٹ میں جاپانی آئٹم چھا گئے ہیں۔ (اب کسی چیز کی بہتات اس کے معیار کو تو متاثر کرتی ہی ہے۔ زندگی میں ایک آدھ عشق کیا جائے تو شاید معیار برقرار بھی رہے، بیک وقت پانچ چھ معاشقے کیے جائیں تو معیار کا اندازہ آپ خود لگائیے)۔

زندگی ایک ہی ڈگر پر چلتی رہے تو کتنی بے مزہ اور بے لطف ہو جاتی ہے۔ بوگس اور بورنگ! صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے۔ وہی معمول کے کام کاج، وہی چولہا چکی، وہی دال روٹی، وہی سونا وہی جاگنا..... یہ بھی کوئی زندگی ہے! فارمولا سی! جبری سی! قید با مشقت کی طرح! دروازہ بند، کھڑکی بند، پردے گرے ہوئے، میل جول پہ پابندی! آنے جانے کی حد بندی! روایات کی پاسداری! چنانچہ جیسے ہی پردہ اٹھا، کھڑکی کھلی، عشاق کا ریلہ اس کھڑکی سے باہر نکل آیا۔ (نوجوان تو نوجوان بوڑھوں نے بھی دوڑ لگا دی) قدامت پسند، جدت پسند، رجعت پسند، سب ہی اس آتش عشق میں بے خطر کود پڑے اور کہہ اٹھے کہ ''یار ڈاڈی آتش عشق نے لائی

اے ہو یار سانوں لگ گئی بے اختیاری سینے دے وچ نہ سمائی اے''

متاثرین عشق میں سب سے زیادہ نازک حالت نوجوان نسل کی ہے چونکہ یہ نسل زندگی کے نشیب و فراز، ذمہ داریوں، تلخیوں اور حقائق سے قدرے نا آشنا ہوتی ہے، ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ لیتی ہے۔ زلفِ گرہ گیر کے دام میں گرفتار ہونے کو عین خوش بختی گردانتی ہے ۔

خانہ زادِ زلف میں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا!

اب دنیا وہ نہیں رہی جواب سے پہلے تھی، اب میلوں کی مسافت گھنٹوں میں اور گھنٹوں کی منٹوں میں طے ہو جاتی ہے۔ اب اس کے اقدار میں اتنی تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے جتنی تیزی سے موبائل کے ماڈل میں آ رہی ہے۔ اب ایک آدھ عشق پر گزارا کرنا اپنے آپ کو پھسڈی، نکما، بدذوق، بددماغ، دقیانوسی، نااہل، ان کلچرڈ اور ایپنارمل باور کروانا ہے، چنانچہ بیک وقت کئی معاشقے چلانا آج کل اتنا ہی ضروری خیال کیا جاتا ہے جتنا سیاست میں بدعنوانی ضروری خیال کی جاتی ہے، اس لیے وہ نوجوان نسل جو براہِ راست آزاد ماحول، روشن خیال والدین اور راہِ محبت میں لٹانے کے لیے بے حساب دولت نہیں رکھتی، معاشی تنگی کے ساتھ ساتھ والدین کی تنگ نظری کا بھی شکار رہتی ہے، جن کے لیے پہننے کو دو جوڑے، کھانے کو دو وقت کی روٹی اور مرنے کے لیے دو گز زمین کا حصول بھی دشوار ہوتا ہے وہ بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیتے ہیں۔ (دل کیا صرف اہل ثروت ہی کے پاس ہوتا ہے!) یہ جو دائیں بائیں ہر کوئی اپنے فرینڈ کی باتیں کرتا ہے ۔

یہ لوگ تذکرے کرتے ہیں اپنے لوگوں کے
میں کس سے بات کروں! اب کہاں سے لاؤں اُسے!

یہ جو موبائل فون کی کمپنیاں روز نئے نئے پیکج کا اعلان کرتی رہتی ہیں.....! یہ جو ہر شب ٹی وی کے ڈرامے ایک ہیرو اور ایک ہیروئن کے گرد گھومتے رہتے ہیں ..... یہ جو پبلک پارکوں میں پریمی جوڑے بیٹھے ہوتے ہیں ! ..... یہ جو قائداعظم کے مزار پر ہجومِ عاشقاں نظر آتا ہے۔ یہ جو موبائل پہ باتیں ہوتی رہتی ہیں!..... یہ جو کو چنگ سینٹرز میں محبت کی تھیوری پڑھائی جاتی ہے!..... یہ جو اتنے تزک و اہتمام سے ویلنٹائن ڈے منائے جاتے ہیں ! ..... یہ جو اخباروں میں ''ایک پیغام اپنے پیاروں کے نام'' شائع کیے جاتے ہیں !..... یہ جو ایف ایم پہ محبت کے پیغام نشر کیے جاتے ہیں!.....تو آخر!..... ہم کیوں باوضو رہیں!..... اپنا دامن بچائے رکھیں !..... چادر اور چار دیواری کے تقدس کو برقرار رکھیں! ..... ہم کیوں اپنی روایات سے چمٹے رہیں!..... ہم کیوں ان باتوں کو برا سمجھیں! ہم کیوں اپنی ذات پر دقیانوسیت کا لیبل لگائے رکھیں! خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ شہر میں ڈینگی وائرس پھیل جائے تو مچھر دانی لگانے کے باوجود مچھر کاٹ ہی لیتا ہے۔ محبت کے دام میں ہر طبقہ خیال آ گیا۔ سیر سپاٹے، تحفے تحائف، ہوٹلنگ نہ سہی موبائل پہ باتیں ہی سہی..... کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ باتیں .....ملاقاتیں.....

رابطے..... کہانی کچھ آگے بڑھی لڑکے کے گھر والے رشتہ مانگنے آئے.....لڑکی کے گھر والے اتنے روایتی ثابت ہوئے کہ ذات پات، تعلیم، آمدنی، مسلک و مذہب پر اڑ گئے ..... رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ عموماً ایسی ہی صورتحال میں نام نہاد عاشق برا نہیں مناتے یہ سوچتے ہیں کہ تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی! لیکن کچھ نوجوان ایس بات کو انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور اس انکار کا مزہ چکھانے کے لیے منصوبہ بندی کرنے لگتے ہیں اور موقع ملتے ہی لڑکی کے منہ پر تیزاب پھینک دیتے ہیں (اس کو اور اس کے خاندان کو ساری عمر کے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں لڑکی حقیقتاً کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی) کبھی گھر میں گھس کر لڑکی کو قتل کر دیتے ہیں (خللِ دماغی کا بیّن ثبوت دے دیتے ہیں)۔

بعض دفعہ لڑکیوں (بچیوں) کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ اس فرسودہ ماحول سے باہر نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ کسی سے پینگیں بڑھائی جائیں۔ چیٹنگ کرتے کرتے طے کر لیتی ہیں کہ کالج کا بہانہ کر کے گھر سے نکلیں گے اور پی کے نگر پہنچ جائیں گے۔ اگر ان کا تعلق گاؤں دیہات سے ہو تو بھاگنے کی اطلاع جنگل کی آگ کی طرح آناً فاناً پھیل جاتی ہے ان کے باپ بھائیوں کا غیرت مند خون آنکھوں میں اتر آتا ہے۔ ہر چند کہ یہ پریمی جوڑا کورٹ میرج کر چکا ہوتا ہے لیکن گھر والے ان کا سراغ لگا کر ہی دم لیتے ہیں اور بالآخر کاروکاری کے جرم میں سفاکی سے ان کا قتل کر دیتے ہیں۔ (آئے دن ایسے واقعات کی اطلاع اخباروں سے ملتی رہتی ہے لیکن ان واقعات سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے کارِ جنوں میں روز بروز اضافہ ہی دیکھنے میں آ رہا ہے۔) شہروں میں ایسے واقعات (یعنی گھروں سے بھاگنے اور کورٹ میرج کرنے کے) اتنے جان لیوا ثابت نہیں ہوتے، ہاں عارضی طور پر بدنامی اور شرمندگی کا باعث بنتے ہیں۔ پھر زندگی معمول پر آ جاتی ہے۔ گھر والوں کی طرف سے وقتی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے پھر یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی! کچھ یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ چلو اچھا ہوا..... رشتوں کا حصول کون سا آسان ہے! شادی کے اخراجات کون سا قابل برداشت ہیں! بال بال قرضوں میں جکڑ جاتا ہے۔ اچھا ہے ان جھمیلوں، بکھیڑوں سے صاف بچ گئے۔ ایک ذرا خاندان میں باتیں بنیں ..... تو! ..... دنیا کب چپ رہتی ہے.....!!

اس غیر معیاری محبت کا انجام بھی کچھ معیاری نہیں ہوتا۔ جب زندگی اپنے تمام تر حقائق کے ساتھ سامنے آتی ہے..... ضروریات.....ذمہ داریاں.....مکان کا کرایہ.....آٹے دال کا بھاؤ ..... محدود آمدنی ..... آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ روز روز کی چخ چخ ذات اور کردار پر شک کی راہ سجھاتی ہے، محبت کا الاؤ ایسے بجھتا ہے کہ تعلق بوجھ بن جاتا ہے اور یوں ٹوٹتا ہے جیسے کبھی جڑا ہی نہ تھا۔ آگ کا دریا عبور کر کے جو خوابوں کا محل تعمیر کیا گیا تھا وہ اپنے ہاتھوں مسمار کر دیا جاتا ہے۔ دونوں اپنی اپنی راہ لیتے ہیں (اور اس دوران اگر کوئی تیسرا آ جاتا ہے تو اس غریب کی مٹی پلید ہو جاتی ہے۔ وہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ ایک نامکمل شخصیت..... ایک ناآسودہ طبیعت.....ایک منتشر خیال ذہنیت ..... یا تو معاشرے سے

اپنا انتقام لیتی ہے یا خود کسی کا آلۂ کار بن جاتی ہے) گھر توڑ کر
نکلنے والی لڑکی ساری عمر اپنی بقا کی جنگ لڑتی رہتی ہے، اپنے
نازک شانوں پر معاش کا بوجھ اٹھاتی ہے۔ عمر بھر کی آبلہ پائی
بھی اسے منزل تک نہیں لے جاتی۔ ساری عمر دشت مسافرت
میں ہی رکھتی ہے.....!!!

نوید اسلام صدیقی

خطبات، نسل در نسل کا ساتھ

'خطبات' مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی وہ عظیم تصنیف ہے جو اس قوم کو بیدار کرنے کے لیے پون صدی قبل تحریر کی گئی۔ کتاب پڑھیں اور امت مسلمہ کے حالات پر غور کریں تو یہ بات سمجھ آتی ہے کہ اس دور اندیش مفکر نے بالکل واضح انداز میں اس قوم کی بیماری کی تشخیص کر دی تھی لیکن اتنے عشرے گزرنے کے باوجود غفلت میں پڑی ہوئی قوم میں کسی لحاظ سے کوئی تبدیلی کہیں نظر نہیں آتی۔ مولانا مودودیؒ کتنی دردمندی سے لکھ رہے ہیں:

''جہالت اور افلاس اور قرضداری نے ہر جگہ تم کو ذلیل و خوار کر رکھا ہے۔ کیا یہ خدا کی رحمت ہے؟ اگر یہ رحمت نہیں، بلکہ کھلا ہوا غضب ہے تو کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان اور اس پر خدا کا غضب نازل ہو! مسلمان اور ذلیل ہو! مسلمان اور غلام ہو! یہ تو ایسی ناممکن بات ہے جیسے کوئی چیز سپید بھی ہو اور سیاہ بھی۔ جب مسلمان خدا کا محبوب ہوتا ہے تو خدا کا محبوب دنیا میں ذلیل و خوار کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا نعوذ باللہ تمھارا خدا ظالم ہے کہ تم تو اس کا حق پہچانو اور اس کی فرماں برداری کرو، اور وہ نافرمانوں کو تم پر حاکم بنا دے، اور تم کو فرماں برداری کے معاوضے میں سزا دے؟ اگر تمھارا ایمان ہے کہ خدا ظالم نہیں ہے اور اگر تم یقین رکھتے ہو کہ خدا کی فرمانبرداری کا بدلہ ذلت سے نہیں مل سکتا، تو پھر تمھیں ماننا پڑے گا کہ مسلمان ہونے کا جو دعویٰ تم کرتے ہو اسی میں کوئی غلطی ہے۔'' (خطبات، اشاعت ۵۱، صفحات ۲۶، ۲۷)

اللہ کے کلام پر ظلم کا سلسلہ اسی طرح جاری ہے بلکہ زیادہ افسوس ناک صورت یہ ہے کہ ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی اور چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک نیا ملک پاکستان وجود میں آیا۔ ہم نے یہ سمجھ لیا کہ ہم نے یہ ملک مسلمانوں کے لیے حاصل کیا ہے اب ہم جو چاہیں کریں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کی جو چاہے تشریح کریں۔ خدا کے احکامات کا عملاً مذاق اڑائیں۔ اس کا فرض ہے کہ ہم پر اپنی رحمتوں کی بارش کرتا رہے۔

ہم نے وطن عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اپنی نئی نسل کو نہ اسلام کی تعلیم دی، نہ اسلامی تعلیمات پر عمل کیا۔ نتیجتاً آج پوری قوم اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں:

''پس جو قوم خدا کی کتاب رکھتی ہو اور پھر بھی ذلیل و خوار اور محکوم و مغلوب ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ ضرور کتاب الٰہی پر ظلم کر رہی ہے اور اس پر یہ سارا وبال اسی ظلم کا ہے۔ خدا کے اس غضب سے نجات پانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کی کتاب کے ساتھ ظلم کرنا چھوڑ دیا جائے اور اس کا حق ادا

کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر آپ اس گناہ عظیم سے باز نہ آئیں گے تو آپ کی حالت ہرگز نہ بدلے گی خواہ آپ گاؤں گاؤں کالج کھول دیں اور آپ کا بچہ بچہ گریجوایٹ ہو جائے اور آپ یہودیوں کی طرح سودخوری کر کے کروڑ پتی ہی کیوں نہ بن جائیں۔'' (خطبات، اشاعت ۵۱، صفحات ۳۶، ۳۷)

'خطبات' کتاب کا نفس مضمون ، زبان، امثال آدمی دیکھتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے۔ آج سے ستر سال قبل بھی یہ کتاب جدید تھی اور آج بھی جدید تر ہے۔ یہاں میں اپنی فیملی کی مثال دوں گا کہ کس طرح پانچ نسلیں اس کتاب سے فیض یاب ہوئی ہیں۔

مولانا مودودیؒ سے والد محترم نعیم صدیقی مرحوم کا تعلق ۱۹۳۸ء کے لگ بھگ ہوا جب آپ نے اپنے گاؤں (خانپور ضلع چکوال) میں رہتے ہوئے ماہنامہ ''پیغامِ حق'' میں پہلی دفعہ ابوالاعلیٰ مودودی کا نام بطور مضمون نگار پڑھا۔ اس مضمون میں ایک اسلامی نو آبادی ''دارالاسلام'' کے عملی قیام کی دعوت دی گئی تھی۔ آپ نے دادا جان سے اس مضمون کا ذکر کیا۔ وہ نظر کی کمزوری کی وجہ سے خود نہ پڑھ سکتے تھے۔ والد صاحب نے ان کو مضمون پڑھ کر سنایا۔ دادا جان جو سکول ٹیچر (ریٹائرڈ) تھے۔ مولانا مودودیؒ کے نظریات و خیالات سے سو فیصد متفق تھے۔ مولانا مودودیؒ کی اپیل پر والد محترم نے لبیک کہا اور دارالاسلام جانے کا پروگرام بنایا۔ آپ نے دادا جان سے دارالاسلام جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے خوش دلی سے آپ کو جانے دیا۔ دارالاسلام کی مسجد میں ان دنوں مولانا مودودیؒ ہر جمعہ کو خطبہ دیتے تھے۔ آپ نے بھی وہاں کچھ خطبات سنے۔ (خطبات کتاب مولانا مودودی کی انہی تقاریر کا مجموعہ ہے جو آپ ہر جمعہ کیا کرتے تھے)

مولانا مودودیؒ کی ہر مطبوعہ کتاب اور رسالہ دادا جان کو والد صاحب پڑھنے کے لیے بھیجتے تھے۔ خطبات بھی ان کتابوں میں شامل ہے جو دادا جان نے پڑھیں۔ ۶ جنوری ۱۹۴۲ء کو دادا جان اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔

والد صاحب نے دادا جان کے علاوہ خاندان کے اور بھی کچھ بزرگوں کو یہ کتاب پڑھنے کے لیے بھیجی تھی۔

گھر میں ہم سب بہن بھائیوں نے اس کتاب کو بہت زیادہ پڑھا۔ اللہ نے توفیق دی ہم بہن بھائیوں کے بچوں نے بھی اس کو پڑھا۔ بڑی ہمشیرہ بتا رہی تھیں کہ میرے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیوں نے بھی اس کتاب کو پڑھ کر عبادات کی حقیقت کو جانا ہے۔

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ہماری فیملی کی پانچ نسلوں نے اس شمع سے روشنی پائی ہے اسی طرح لاکھوں افراد اور گھرانے اس کی روشنی سے منور ہو رہے ہوں گے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی منور ہوتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ اسلامک پبلی کیشنز کو دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی توفیق دے۔ آمین

عاصمہ غنی

شمع ہدایت

''خطبات'' کے سوویں ایڈیشن کی اشاعت پر

نصاب میں موجود اسلامیات کی کتاب روایتی طریقہ کار سے تعلیمی ضرورت تو پورا کرتی تھی لیکن طالب علم کی روحانی اور اخلاقی زندگی میں کسی تبدیلی یا انقلاب کی ضمانت نہ تھی گھریلو ماحول میں والدین کا فکر عمل و تربیت کے اثرات اور گہرے رنگ موجود تھے۔ مگر شعوری زندگی اور ذمہ دارانہ سوچ کیلئے کوئی مستقل راہنمائی ناپید تھی۔ سکول و کالج میں اساتذہ مذہبی لگاؤ رکھنے والی طالبات کو قدر کی نگاہ سے تو دیکھتے تھے۔ نمبر بھی زیادہ حاصل ہو جاتے تھے۔ مگر مقصد زندگی کو سمجھنے میں ڈور کا سرا اور اس کی حقیقت ہاتھ نہ آتی تھی۔ بکھری سوچوں اور دبی تمنا کو اطمینان اور تسلی نہ تھی۔ ایسے میں خطبات کا ہاتھ لگ جانا نعمت غیر مترقبہ تھی۔ لاعلمی کے اندھیرے، بے عملی کی بے سکونی اور کچھ کرنے کا عزم ایسے لگتا تھا کہ جدوجہد کو صحیح جہت مل گئی۔ تاریکی میں شمع نہیں گویا سو واٹ کا بلب مل گیا۔ مسلمان ہونے کیلئے علم کی ضرورت، کلمہ طیبہ کے معنی سوچنے کی باتیں، مسلمان کسے کہتے ہیں ایمان کی کسوٹی، اسلام کا اصلی معیار گویا ان سارے خطبات نے تلاش حق کی کٹھن منزل کو قریب ہی نہیں آسان اور واضح بھی کر دیا۔ مولانا مودودی کی دی گئی رہنمائی نے انگلی پکڑ کر خود چلنا نہیں دوسروں کو بھی چلانا سکھایا۔ فکر و نظر کی اصل ضرورت کی پہچان بھی کروائی اور منزل کے حصول کیلئے ہمت و قوت بھی دی۔ راستے کے نشیب و فراز بھی سمجھائے اور دجال، گمراہی، شیطان، نفس اور ماحول کے فتنوں سے آگاہی بھی دی۔ دل کی دنیا اور اپنے اندر کے دشمن سے بھی آگاہ کرایا اور باہر ماحول کے دشمن اور حاسدین سے بھی باخبر کیا۔ انفرادی اصلاح و تربیت کا پروگرام بھی بتایا اور اجتماعی ماحول کی صفائی کی ضرورت اور طریقے بھی سمجھائے۔ کتاب کا ہر عنوان گویا دل و دماغ کے اندر موجود سیکڑوں لات و منات پر ضربیں لگانے کو کافی تھا۔ ہر بار پڑھتے ہوئے علم دانی، جہالت، بداعمالی، ظلم و زیادتی کے بت ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے محسوس ہی نہ ہوتے باقاعدہ آواز بھی آتی کہ خرابی کہاں کتنی کب سے اور کس نوعیت کی ہے۔ عقائد و عبادات دونوں ہی اس کی زد میں تھے۔ ایمان باللہ، ایمان بالرسلت اور ایمان بالآخر کی زندگی میں ضرورت، اہمیت، حیثیت اور مقام کی وضاحت ہوئی۔

عبادت کے روح و معانی سمجھ میں آنے لگے۔ نماز، روزہ، جیسی بنیادی عبادات کی پابندی کی طرف تو ماحول متوجہ کرتا تھا۔ مگر ان کی صحیح حیثیت، اہمیت مقاصد اور مطلوب اثرات و نتائج کی وضاحت خطبات ہی نے کی۔ عبادت کے ماحول میں موجود روایتی تصور سے بے زاری پیدا ہوئی اور

زندگی کے ہمہ پہلو عبادت ہونے کا تصور اسی کتاب نے بتایا۔ نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور جہاد کے حقیقی معنی سے آشنائی اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ان کا حصہ اور کردار ادا کرنے کی روح اسی کی مرہون منت ہے۔ اور یہی روح اور حقیقی اسلام کا تصور آدمی میں اخلاص، اطاعت اور فدائیت کی روح پیدا کرتا ہے۔ الحمدللہ ان کی اس تحریر نے نوجوانی سے 24 گھنٹوں میں کچھ وقت روزانہ علم دین سیکھنے کیلئے مختص کرادیا۔

کم از کم اتنا علم ہر مسلمان بچے بوڑھے، جوان کو حاصل ہونا چاہیے کہ قرآن جس مقصد کیلئے اور جو تعلیم لے کر آیا ہے اس کا لب لباب جان لے اور نبی کریمؐ جس چیز کو قائم کرنے آئے تھے اس کو خوب پہچان لے اور اس خاص طریق زندگی سے واقف ہو جائے جو اللہ نے مسلمانوں کیلئے مقرر کیا ہے۔

مسلمان کو کافر سے جدا کرنے والی صرف دو چیزیں ہیں۔ علم اور عمل، مسلمان ہونے اور رہنے کیلئے جس اسلام کی ضرورت ہے وہ محض کلمہ طیبہ پڑھ لینے اور چند ظاہری رسومات اختیار کر لینے کا نام نہیں۔ بلکہ جو شخص اپنے سارے معاملات کو خدا کے حوالے کر دے وہ مسلمان ہے۔ خدا کے حوالے کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنی کتاب اور اپنے رسولوں کے ذریعے جو ہدایت بھیجی ہے اس کو قبول کیا جائے اس میں چون و چرا نہ کی جائے اور زندگی میں جو معاملہ بھی پیش آئے اس میں صرف قرآن وسنت کی پیروی کی جائے۔ جو شخص اپنی عقل اور دنیا کے دستور اور خدا کے سوا ہر ایک کی بات کو پیچھے رکھے اور ہر معاملے میں خدا کی کتاب اور رسول اللہ سے پوچھے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے اور جو ہدایت وہاں سے اس کو ملے بے چون و چرا مان لے اور اس کے خلاف ہر شے کو رد کر دے صرف وہی مسلمان ہے۔ یقین و ایمان کی دنیا کو کلمہ حق کی سچائی پر اس طرح اعتماد دیا۔ ''جب تم اس کے آگے جھک جاؤ گے تو کائنات کی ہر چیز تمہارے ساتھ جھک جائے گی کیونکہ یہ ساری چیزیں بھی اس خدا کی فرمانبردار ہیں دنیا سے آخرت تک وہ پھلتا پھولتا جائے گا ایک لمحہ کو بھی ناکامی اور نامرادی نہ آئے گی۔''

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

وہ مسلم کو اپنی دنیا ہی نہیں آخرت سے خبردار رکھنے کیلئے حقیقی پیمانہ دیتے ہیں۔ دراصل انجام کا فرق آغاز ہی کے فرق کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ جب تک دنیا میں مسلمان اور کافر کے علم و عمل کے درمیان فرق نہ ہوگا آخرت میں بھی انجام کے درمیان فرق نہیں ہوسکتا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ دنیا میں ایک شخص کا علم و عمل وہی ہو جو کافر کا علم و عمل ہے اور پھر وہ آخرت میں اس انجام سے بچ جائے جو کافر کا انجام ہے۔ دین اور شریعت کا خطبہ ہر قسم کے نسبی، لسانی، طبقاتی، گروہی، صنعتی اور ملکی اختلافات اور تعصّبات سے نکال کر ایک امت مسلمہ بننے کا شعور واضح کرتا ہے۔ اتحاد امت اور غلبہ دین کی راہ کا یہ سب سے بھاری پتھر ہی سرکانے سے امت کو اپنی کھوئی ہوئی منزل مل سکتی ہے۔

''نمازیں بے اثر کیوں ہوگئیں'' واضح کر رہا ہے کہ نماز کے مقصود اثرات سے مسلماں کیریکٹر کو مستفید کرتی نظر نہیں آتی تو خرابی نماز کی نہیں اس ادھورے اور جزوی دین کو سمجھنے کی

ہے، جو نظام عبادات کو تو اہم سمجھتا ہے اور اخلاق و معاملات کی دنیا کو الوہی قانون اور ہدایت سے بیگانہ رکھتا ہے۔ مسلم پر مصائب دنیا کے آنے کی بڑی اصل اور آخری وجہ ہے۔ معاشرے کی انفرادی و اجتماعی اصلاح میں نماز اور زکوۃ کے اثرات جو شاندار نتائج پیدا کرتے ہیں کوئی دوسرا نظام معیشت مدمقابل آنے کی جرات بھی نہیں کر سکتا۔ حج اور جہاد کے مقاصد طریق کار، صورت اور پروگرام ایک ترتیب اور تسلسل سے اصلاح قلوب و معاشرہ کے حسن کو بڑھاتا ہے جو اہل زمین کیلئے امن و عافیت سلامتی اور خیر کا باعث ہے۔ خطبات کی شستہ بیانی، روانی، برجستہ امثال، دلنشین انداز اور دلیل کا زور یہ سارے اوصاف اس کے فکر و خیال کو بڑھانے میں مددگار اور معاون رہے اس کے بے شمار جملے زبان زدعام ہیں۔ اس موضوع پر ایسی کتاب میری نظر سے کوئی اور نہیں گزری بیسیوں مواقع پر پڑھنے کے باوجود اس کو بار بار پڑھنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور آتی رہے گی۔ یعنی ان کا مقصد خدا کے بندوں کو فرمانبرداری پر اکسانا، نافرمانی سے روکنا اور اخلاص فی الطاعۃ کی تلقین کرنا ہے۔

مصنف کے ساتھ اس اہم کتاب کی اشاعت کا انتظام کرنے والوں کیلئے بھی دلی دعائیں ہیں۔

آسیہ راشد

بیگم نعیمہ جہانگیر کی یادداشتیں

﴿ان کی وفات سے کچھ عرصہ قبل میں نے ایک طویل ملاقات میں ان کی یادداشتیں مرتب کیں، جن میں سے منتخب حصے پیش کر رہی ہوں﴾

اپوا خواتین کی ایسی تنظیم تھی جس کا مقصد خواتین کے مسائل کو حل کرنا اور جدید علوم کے تقاضوں سے ہمکنار کرنا تھا۔

تقسیم کے کچھ عرصہ بعد ۵۰ء کی دہائی میں جب پاکستان اور امریکہ کی دوستی ہوئی اور پاکستان میں امریکن ایڈ آنی شروع ہوئی تب اپوا کی طرف سے بہت سے لوگوں نے اسکول کھولے جن میں میں بھی شامل تھی۔

اپوا کا اسکول میرے گھر میں

ہمارا گھر زمان پارک لاہور میں واقع ہے۔ زمان پارک کے گرداگرد ان دنوں خالی زمین تھی جہاں غریب لوگوں نے جھونپڑیاں بنا رکھی تھیں۔ یہیں پر گوالوں کی بھی بستی تھی۔ وہ اپنی بھینسیں نہر پر نہلانے جایا کرتے تھے۔ حد سے زیادہ جاہل لوگ تھے، گندی زبان بولتے، بچوں اور عورتوں کو سارا دن ڈانٹتے اور مارتے پیٹتے۔ میں نے جب اپنے گھر کے اردگرد ایسا گندا ماحول دیکھا تو مجھے ان کے بچوں کی فکر ہوئی۔ ان بچوں سے پوچھتی کہ کیا آپ پڑھو گے تو وہ بہت شوق سے کہتے جی ہم ضرور پڑھیں گے۔ وہ مجھ سے گاہے گاہے پوچھتے رہتے کہ آپ سکول کب کھولیں گی؟

اور میں نے اللہ کا نام لے کر اپوا کی طرف سے سکول اپنے گھر میں ہی کھول لیا۔ یوں زمان پارک کی کوٹھیوں کے کواٹروں اور محلے کے غریب گھروں سے ۳۲ لڑکے میرے پاس پڑھنے کے لیے آئے۔

میں نے ۱۹۵۰ء میں اپنے گھر میں پرائمری سکول کی بنیاد رکھی۔ سکول میں دو ٹیچر تھیں جنھیں تنخواہ اپوا دیتی تھی اور انھیں ایڈ بھی ملتی تھی۔ گھی، دودھ، گیہوں، کپڑے یہ بچوں کی ماؤں کو مہینے میں ایک دفعہ دیتے۔ غریب والدین کے بچے ان چیزوں کے لالچ میں بچوں کو سکول سے نہ اٹھاتے اور نہ ہی انھیں کہیں ملازم رکھواتے۔

ہر سال اس سکول کی انسپکشن ہوتی اور لاگ بک میں اس سکول کے بارے میں لکھا جاتا کہ یہ ایک ماڈل سکول ہے۔ پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد یہ بچے دوسرے سکولوں میں داخلہ لے لیتے یوں یہ سلسلہ کئی سالوں تک چلتا رہا۔

بھٹو اور نیشنلائزیشن

۱۹۷۰ء میں یہ سکول ختم ہو گیا۔ یہ ایک دلخراش داستان ہے۔ بعض اوقات حکمرانوں کے مفادات قوموں کی تاریخ کو سنگین موڑ پر لا کھڑا کرتے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کا دورِ حکومت تھا۔ سن ۱۹۷۰ء تھا جب پی پی کے رہنما اور پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے تمام سکول قومی ملکیت میں لے لیے۔ ہمارا ذاتی

گھر اسکول کی وجہ سے شاید قومی تحویل میں چلا جاتا اگر ہمیں بر وقت اطلاع نہ مل جاتی۔ ہوا یوں کہ ایک روز صبح صبح میں نے دیکھا کہ اسکول کے بچے اور ٹیچرز اسکول کا سامان اٹھا کر باہر جا رہے ہیں۔ ایک انسپکٹر ان کے سر پر کھڑا آرڈر جاری کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا آپ میرا اسکول کیوں خالی کروا رہے ہیں، بچوں اور ٹیچرز کو گھر کیوں بھیج دیا گیا ہے۔

میرے استفسار پر انسپکٹر نے مجھے بتایا کہ گورنمنٹ کی طرف سے آرڈر ہوا ہے کہ جتنے بھی سکول ہیں انھیں قومی ملکیت میں لے لیا جائے جن لوگوں نے اپنے گھروں میں پرائیویٹ سکول کھول رکھے ہیں وہ گھر بھی گورنمنٹ کے قبضہ میں چلے جائیں گے۔ میں نے آپ کے گھر کو بچانے کے لیے ایسا کیا ہے ورنہ آپ کو گھر خالی کرنا پڑتا۔

یوں گورنمنٹ نے وہ تمام سکول بھی اپنے قبضہ میں لے لیے جو لوگوں کے ذاتی گھروں میں کھلے ہوئے تھے اور گھر والوں کو اپنی ذاتی رہائش چھوڑ کر کرائے کے مکانوں میں رہنا پڑا۔ لوگ راتوں رات امیر سے فقیر ہو گئے۔ ان دنوں ملیں، فیکٹریاں، ہر چیز ہر ادارہ قومی تحویل میں جا چکا تھا۔ مل تک حکومتی قبضے میں چلی گئی۔ یہ سب سراسر ناانصافی پر مبنی تھا مگر حکومت کے غلط فیصلے کے آگے سب لوگ بے بس تھے۔ بعد میں حکومت سے نہ تو سکول چلے اور نہ ہی ملیں اور فیکٹریاں بلکہ ہماری تعلیم اور معیشت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔

ٹی بی کا مرض اور ملازمین کا میڈیکل چیک اپ:

جن دنوں میں سکول چلا رہی تھی انہی دنوں کی بات ہے۔ زمان پارک کی کوٹھیوں کے ملازمین کی صحت کے بارے میں مجھے تشویش رہنے لگی اس کی وجہ یہ تھی کہ زمان پارک کے ایک ملازم کو ٹی بی ہو گئی۔ ٹی بی تو چھوت کا مرض ہے جو ایک سے دوسرے کو با آسانی لگ جاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہاں تو اتنے ملازم ہیں کسی اور کو بھی ٹی بی ہو سکتی ہے۔ مجھے ان کے بارے میں سوچنا چاہیے اور کچھ کرنا چاہیے۔

میں نے چھوٹی بچیوں کے دو گروپ بنائے۔ اپنی بیٹی شاذی اور ایک لڑکی کے سپرد یہ کام کیا کہ جاؤ اور زمان پارک کی کوٹھیوں کے ملازمین کی فہرست بنا کر لاؤ اور تمام ملازمین کے نام لکھوان دونوں نے نہایت ذمہ داری کے ساتھ یہ کام کیا اور تقریباً ۳۰۰ ملازمین کی فہرست لا کر مجھے دے دی جو ان کوارٹروں میں رہ رہے تھے۔

اگلا مرحلہ ان کے میڈیکل چیک اپ کا تھا جو کہ نہایت مشکل کام تھا لیکن میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ہر صورت میں یہ کام کرنا ہے اور اگلے چند دن میں بہرصورت اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔

چٹاگانگ کی سیر:

ایک بار میٹنگ کے سلسلے میں ہمیں چٹاگانگ جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) کا ایک مشہور شہر ہے۔ میں اور خورشید نیازی، بیگم جی اے خان کی سربراہی میں وہاں گئے۔ میٹنگ کے بعد میں نے بیگم جی اے خان سے کہا آپ خورشید کو چھوڑ جائیں ہم لوگ چٹاگانگ اور دیگر شہر دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے میری بات مان لی۔ ہم دونوں نے خوب سیریں کیں۔

چٹاگانگ میں ہمارا قیام رانگامتی میں ہوا جو ایک

اسٹیٹ ہے اس سٹیٹ کے سربراہ بعد میں وزیر بنے۔ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) مغربی پاکستان سے بہت مختلف تھا۔ جنگل، بارشیں، سپاری کے درخت، سی پورٹ، سبھی دل موہ لینے والے نظارے تھے۔ چٹاگانگ، بنگلہ دیش کا دوسرا بڑا شہر ہے اور ایک معروف ترین انٹرنیشنل سی پورٹ (تجارتی بندرگاہ) ہے۔ اس کی سرسبز پہاڑیاں، جنگلات، اس کے خوبصورت ترین ساحل، اس کی ٹھنڈی مرطوب آب و ہوا ہمیشہ سیاحوں کو اپنی جانب متوجہ رکھتی ہے۔ چھٹیاں گزارنے والوں کے لیے یہ خوبصورتی تفریحی مقام ہے۔

ایک چینی سیاح جو شاعر بھی تھا ہیون تسانگ اس نے ساتویں عیسوی میں اس کے بارے میں کہا تھا۔ Sleeping beauty emerging from mist and water.

سولہویں صدی میں اسے "Porto Grand" کا نام دیا گیا کیونکہ یہاں پرتگالی قابض تھے اور یہ ان کی کالونی کہلاتا تھا۔ اس شہر کی دو خاص عمارتیں شاہی جامع مسجد اور قدم مبارک مسجد بہت مشہور ہیں۔ یہاں کا میوزیم بنگلہ دیش کے قبائلیوں کی داستان پیش کرتا ہے۔ جسے سیاحوں کے لیے بہت ہی دلچسپ اور دلکش انداز میں سجایا گیا ہے۔

دریائے کرنافلی کے کنارے واقع چٹاگانگ کا کاکسس بازار بہت مشہور ہے جو بھی چٹاگانگ آتا ہے وہ اور کہیں جائے نہ جائے یہاں ضرور جاتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کا مزار ایک پہاڑی علاقے نصیر آباد میں واقع ہے جو چٹاگانگ سے چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ان کے مزار پر فاتحہ پڑھنا بھی سیاحوں کی سیر کا لازمہ ہے۔ اس مقبرے کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں پانی کا ایک بہت بڑا تالاب ہے جس میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں کچھوے رہتے ہیں۔ روایت ہے کہ یہ کچھوے اول میں جنات کی نسل میں سے ہیں جو اس شکل میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ آج سے گیارہ سو سال پہلے یہ کسی روحانی بزرگ کے غیض وغضب کا شکار ہو کر کچھوے بن گئے تھے۔ اس نے انھیں جنات سے کچھوؤں کی شکل میں تبدیل کر کے اس تالاب میں بند کر دیا ہے۔

انسانی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ ہمیشہ مافوق الفطرت چیزوں کی تلاش میں رہتا ہے لہٰذا یہ من گھڑت کہانی بھی ہر کسی کو اپنی جانب کھینچتی ہے اور وہاں سیاحوں کا ہجوم لگا رہتا ہے۔

دریائے کرنافلی کے دہانے پر واقع بندرگاہ بنگلہ دیش کی سب سے اہم پورٹ ہے جہاں سے ہر قسم کے تجارتی سامان کی برآمد و درآمد ہوتی ہے۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی.....

سابقہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کے نام سے پکارنا ہر محبِّ وطن پاکستانی کے لیے بہت مشکل کام رہا ہے۔ ہم لوگوں نے اپنی کوتاہیوں اور آپس کی نااتفاقیوں کی وجہ سے اپنے ملک کا آدھا حصہ کھو دیا۔ اب بچے کھچے پاکستان کے حالات بہتر کرنے کے لیے ہمیں بے حد محنت کی ضرورت ہے اگر ہم نے اب بھی اپنی آنکھیں نہ کھولیں تو بہت دیر ہو جائے گی۔ قدرت سزا دینے میں دیر نہیں کیا کرتی۔ چٹاگانگ کا ذکر کرتے ہوئے ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم اپنے کسی پیارے بچھڑے ساتھی سے مگر

جواب اجنبی بن چکا ہے دوبارہ مل رہے ہوں اسی موقع کے لیے فیض احمد فیض نے کہا تھا۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
تھے بہت بے درد لمحے ختم دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

جنرل ضیاء الحق کا دور:

۱۹۷۹ء میں جنرل ضیاء الحق نے معاشرے کی اصلاح کے لیے تمام خواتین کو چادریں اوڑھنے کا حکم جاری کیا۔ میڈیا کے ذریعے چادروں کے فیشن کو رواج دیا گیا۔ فیشن ڈیزائنرز سے کہا گیا کہ وہ ایسے لباس متعارف کروائیں جس میں بڑی بڑی چادریں باریک دوپٹوں کی جگہ لے لیں۔ یوں ملوں، فیکٹریوں میں تھری پیس سوٹ دھڑا دھڑ بننے شروع ہو گئے۔

ضیاء الحق کے اس اقدام سے ماڈرن طبقے میں کھلبلی مچ گئی یہ وہ خواتین تھیں جو سر سے دوپٹہ لینا بھی پسند نہ کرتی تھیں۔ انھوں نے 'ویف' نامی تنظیم بنائی اور اس کا ایک بھرپور اجلاس بلایا گیا۔

وائٹ ہاؤس جوزمان پارک کے قریب ہی واقع ہے، وہاں ان خواتین کی میٹنگ ہوئی، مجھے بھی بلایا گیا۔ میں ان کے اجلاس میں شرکت کے لیے وہاں پہنچ گئی۔ ویف والوں نے پردے کے خلاف پمفلٹ چھاپ رکھے تھے اور احتجاجاً کالی چادریں لی ہوئی تھیں۔ انھوں نے پردے کے خلاف تقریریں کیں ''ہمیں پردہ نہیں چاہیے، پردہ منافق لوگ کرتے ہیں ہمیں آزاد ماحول چاہیے۔ جدید ماحول ہوگا تو ہم سب کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکیں گے۔ پردہ دل کا ہوتا ہے، آنکھ کا ہوتا ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

میں نے جب ان کے خیالات سنے تو مجھے بہت دکھ ہوا کہ یہ خواتین سرعام اللہ تعالیٰ کے احکامات کو جھٹلانے کی سعی کر رہی ہیں۔ مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کیوں نہ ہم شر کے مقابل خیر پھیلانے کے لیے کچھ اقدام کریں۔ مسلمان ہونے کا تقاضا ہے کہ اللہ سے محبت کی بنیاد پر کوئی ٹھوس اور متحرک کام کیا جائے۔ یوں میں نے دینی ذہن کی حامل خواتین کی تنظیم بنانے کا ارادہ کیا۔ میں نے اور بیگم خورشید نیازی نے بیگم مودودی صاحبہ، سابق وزیراعلیٰ پرویز الٰہی کی اہلیہ قیصر پرویز صاحبہ، ماڈل ٹاؤن کلب کی صدر بیگم نجم منور علی اور نثار فاطمہ صاحبہ سے ملاقاتیں کیں۔ ان سب میں سے بیگم نثار فاطمہ صاحبہ نے سب سے بڑھ کر ہمارا ساتھ دیا اور کہا میں آپ کے ساتھ مل کر تنظیم بناؤں گی جو ویف کے اقدامات کے مقابل کام کرے گی۔

پاک انجمن خواتین:

پاک انجمن خواتین کا قیام عمل میں آتے ہی ہم نے سب سے پہلے اس وقت کے صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کی بیگم کو چادریں بنوا کر بھیجیں۔ ہم سب نے مل کر بیگم نثار فاطمہ کو ممبر قومی اسمبلی بنوایا تاکہ وہ اسمبلی میں بیٹھ کر حق کی بات کر سکیں۔ چار سال تک ہم لوگوں نے مل کر کام کیا۔

پاک انجمن خواتین میں آہستہ آہستہ بہت سے لوگ

شامل ہوتے چلے گئے یہ لاہور کی ایلیٹ کلاس خواتین کی ایک جماعت تھی جو دینی ذہن کی حامل خواتین تھیں اور پاکستان میں اسلام کی سربلندی چاہتی تھیں۔

میرا مزاج شروع سے سادہ رہا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے گھر کو تزئین و آرائش سے مبرا رکھا۔ میرے گھر میں آرام دہ فرنیچر ضرور ہے مگر سامان آرائش میں نے کبھی نہیں خریدا۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ گھر رہنے کی جگہ ہوتی ہے سجانے کی نہیں جو آرام اور سکون انسان کو سادگی میں ملتا ہے وہ تکلف میں نہیں۔ بہت سارا سامان اکٹھا کر لینے کے بعد سارا دن ان کی جھاڑ پونچھ میں لگ جاتا ہے۔ نہ معلوم لوگ اپنے گھروں کو اتنا سجاتے کیوں ہیں۔ جب ہم نے اپنا نیا گھر بنایا تو میری بیٹی سارہ کی سہیلیوں نے تحفے تحائف لانے شروع کیے۔ یوں ہمارے گھر میں جو چند سجاوٹی اشیاء موجود ہیں وہ ہمارے احباب کی عنایات ہیں۔ سیدھے سادھے صاف ستھرے گھر کو دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ حد سے زیادہ سجے ہوئے گھروں کو دیکھ کر دوسروں کے دلوں میں احساس کمتری پیدا ہونے لگتا ہے۔

لوگ اپنی تمام عمر چیزیں اکٹھی کرنے میں صرف کر دیتے ہیں حالانکہ زندگی کا مقصد صرف اور صرف علم کی جستجو ہونا چاہیے۔ زندگی ہمیشہ علم حاصل کرنے اور علم پھیلانے میں گزارنی چاہیے۔ میں نوجوان نسل کو پیغام دینا چاہتی ہوں پڑھو، لکھو اور پڑھاؤ بس یہی زندگی کا سبق ہے۔ میں اپنے آپ کو اتنا باعلم نہیں سمجھتی۔ میں نے ہمیشہ اچھے لوگوں سے سیکھنے کی کوشش کی ہے۔

میں اپنے بچوں کو یہ نصیحت کرتی ہوں کہ زندگی گزارنے کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے وہ بہترین ہے۔ ہمیں ریا اور نمائش سے بچ کر اپنی زندگیاں گزارنی ہیں۔

میں ہمیشہ سے عورتوں کو باوقار اور باعزت مقام پر دیکھنے کی متمنی ہوں۔ مجھے تمام مسلمان بچیوں سے یہ کہنا ہے کہ خود کو ڈھانپ کر اور مکمل لباس میں باہر نکلیں اپنے کردار و عمل سے ایک سچی مسلمان اور مثالی پاکستانی خاتون کی نمائندگی کریں۔

دُکھ کیا ہوتے ہیں

یہ میرے بچے جنہوں نے کبھی دکھ دیکھا ہی نہ تھا، انہیں کیا معلوم کہ دکھ کیا ہوتے ہیں اور اب جب ایک کا سامنا ہے تو یہ نہیں جانتے کہ ابھی کیا کچھ ان کا منتظر ہے!

وقت اپنی رفتار سے چلتا ہی رہتا ہے۔ دنوں کا چابک اسے ڈگر پر رواں دواں رکھتا ہے اور یہ گرتا پڑتا اس سمت میں چلتا چلا جاتا ہے جس کا نام ابد ہے اور جس کی جستجو میں ازل ایک عرصے سے بھاگ رہا ہے۔ سوچ اپنی ہی دھن میں مگن رہتی ہے اور ان دائروں میں گھومتی چلی جاتی ہے جن کا کوئی نام ہی نہیں۔ انسان خاموش، سر جھکائے موت کی لکیروں پر سے زندگی کے سنگریزے چنتے چلتے چلے جاتے ہیں، کبھی اپنے نشان تلاش کرتے ہیں اور کبھی اپنے وجود کے مقصد کی جستجو میں زندگی قطرہ قطرہ کر کے اپنی ہتھیلیوں پر جمع کرتے رہتے ہیں۔ پھر اسی پانی میں کسی تصویر کے ابھر آنے کے منتظر رہتے ہیں۔ اور کبھی اس پانی کے نیچے اپنے ہی ہاتھوں کی لکیروں کے زاویے بدلتے دیکھتے رہتے ہیں۔ وقت کی چھلنی میں سے انسان چھن چھن کر گرتے رہتے ہیں اور خدا کی زمین کے سینے پر قبریں بن کر ابھرتے رہتے ہیں۔ وقت بہت عجیب ہے اور اس سے بھی عجیب اس کی لامتناہی ہونے کی خواہش ہے کہ اس خواہش کو دوام بھی ہے اور اس دوام میں کسی طرح کا کوئی اطمینان بھی پوشیدہ نہیں۔

یہ زندگی بھی عجب ہے، سوچنے بیٹھو تو چند لمحوں میں ہاتھوں میں یوں سمٹ آتی ہے جیسے بنگال کا ریشم پورے کا پورا تھان ماچس کی ڈبیہ میں بند ہو جایا کرتا تھا۔ اور پھر کبھی وہ ہاتھ نہیں رہتے جو اس کپڑے میں وہ ملائمت پیدا کیا کرتے تھے اور کبھی وقت کے دامن میں وہ لوگ نہیں رہتے جن کے دم قدم سے زندگی کے سارے رنگ ہی خوبصورت لگتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کروں تو ننھی سی مریم کا وجود آنکھوں کے سامنے اس روز ابھر آتا ہے جب اس کی ننھی آواز پہلی بار ہمارے کانوں میں گونجی تھی اور مریم کے پاپا سے جب ان کے دوست ڈاکٹر سجاد نے پوچھا کہ آج کیسا لگ رہا ہے تو انہوں نے کہا کہ بہت اچھا اور بہت عجیب اور ایسا لگتا ہے کہ دو ننھے ہاتھ مجھے میری قبر کی جانب دھکیل رہے ہیں۔

پھر وہ ہماری ننھی بچی، کب بڑی ہوئی ہمیں معلوم ہی نہ ہوا، اس کی آنکھوں کی شوخی جو باپ کو دیکھ کر اور بھی سوا ہو جاتی تھی اور اس کا وہ لاڈ لا ہونا جس میں ایک عجب طور کی معصومیت بھی تھی۔ میں اکثر اسے کتنی ہی باتوں پر ٹوکتی اور وہ کیسے اپنے باپ کی محبت کی اوٹ میں چھپ جایا کرتی۔ اب سوچتی ہوں تو دل کٹنے لگتا ہے۔ میری ننھی بچی کیسے دنوں میں ذمہ دار ہوگئی ہے اور اس کے لہجے میں اپنے باپ سے دوری کی تھکان اتر آئی ہے۔ جب کبھی وہ بے بس ہو کر میرے

دامن میں منہ چھپا لیتی ہے تو مجھے سمجھ نہیں آتا کہ کیسے اس کے دل کو اس دکھ سے پاک کر دوں۔ اور وہ عائشہ جو کتنی چلبلی اور الہڑ سی تھی، جس کی شرارتی باتوں پر ہم اکثر ہی ہنسا کرتے اور وہ اتنی ہی معصومیت سے آنکھیں ٹپٹپا کر بولتی کہ آپ ہنستے کیوں ہیں۔ ہم کیوں ہنستے تھے کیا بتاتے! اور اب تو ہم ہی نہیں رہے، میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ اتنی اکیلی اور کئی بار اتنی کمزور کہ اپنے بچوں کی آنکھوں سے آنسو نہیں پونچھ پاتی۔ لیکن یہ زندگی کمال شے ہے، اس کے ترازو میں ہر شخص برابر ہے اور وقت کے باٹ ہر کسی کے لئے ایک ہی جیسے ہیں۔ ہر کسی نے جانا ہے اور ہر کوئی ہی اس کسوٹی پر تولا جانا ہے۔ یہ دکھ کبھی ایک شخص تک محدود نہیں رہتا اس کی لہر ہر انسان کے قدموں کو چھو کر ہی پلٹتی ہے۔ کتنے ہی ایسے لوگ جن کے بارے میں ان کے اردگرد کے لوگ یہ سوچتے ہیں کہ شاید ان کے بغیر زندگی چل ہی نہ پائے، جب زندگی انہیں سمیٹ کر موت کے حوالے کر دیتی ہے تو کیسا خالی پن ان کے اردگرد پیدا ہو جاتا ہے۔ کون کہے کہ اس ادھورے پن میں کیسے بین ہوتے ہیں، اس خاموشی میں کتنی سسکیاں ہوتی ہیں، اس سونے پن میں کتنی آوازیں ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کی وابستگیوں میں کتنے لوگ اپنے آپ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ کتنے بچپنے کبھی نہ لوٹنے کی سرحد عبور کر جاتے ہیں۔ اُن لوگوں کو شاید خود بھی علم نہیں ہوتا کہ کتنی زندگیوں کے سوتے ان کی مسکراہٹوں سے پھوٹتے ہیں اور کتنی مسکراہٹیں ان کی آنکھوں کی روشنی سے جنم لیتی ہیں۔

وقت کے جھرنوں میں ایسی کتنی آوازیں کھو چکی ہیں اور احساس کے کتنے ہی دروازے اپنے آپ ہی بند ہو گئے ہیں۔ سدا باتیں کرنی والی چڑیاں چپ چاپ سوگوار ہو گئی ہیں اور صبح کی پہلی ہوا بھی بوجھل ہو کر صحن میں آ بیٹھی ہے۔ کئی بار ایسا لگتا ہے کہ اگر دیکھ کر قدم نہ رکھا تو شاید پیروں تلے آ کر یہ کچلی ہی جائیگی۔ شام ڈھلے کتنی ہی ویرانیاں دبے قدم گھر کے بند دروازے کھول کر اندر آ جاتی ہیں اور آ کر کمروں میں اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہیں، وہ جگہیں جہاں آوازیں تھیں، قہقہے تھے، اب وہاں خاموشی ہے، اداسی ہے، سائے ہیں۔

لیکن اس زندگی کی سب سے اچھی بات یہی ہے کہ یہ کبھی بھی کسی کے لئے بھی اپنا رستہ کھوٹا نہیں کرتی۔ چلتی چلی جاتی ہے، چلتی ہی چلی جاتی ہے۔ مریم جب کبھی گھبرا کر کہتی ہے امی زندگی کیسی عجیب سی ہو گئی ہے کیسی بے جان، بے آواز اور اس میں کہیں خوشی بھی تو نہیں ہے۔ سارا دن اس انتظار میں گزر جاتا ہے کہ رات ہو گی، سوئیں گے تو شاید پاپا دکھائی دے جائیں تو میں اس کی بے بسی دیکھ کر سوچتی ہوں کہ اسے کیا کہوں کہ یہ میرے بچے جنہوں نے کبھی دکھ دیکھا ہی نہ تھا، انہیں کیا معلوم کہ دکھ کیا ہوتے ہیں اور اب جب ایک کا سامنا ہے تو یہ نہیں جانتے کہ ابھی کیا کچھ ان کا منتظر ہے!

☆☆☆

محشرِ خیال

حمیرا ثاقب.....فیصل آباد

ماشاء اللہ رسالہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ معیاری بھی ہے اور ذوق کی تسکین بھی کرتا ہے۔ بس ''سمارٹ'' بہت ہے..... ہم جیسے ''صحت مندوں'' کو تو کم از کم بہت دبلا لگتا ہے۔ کیا اس کے صفحات بڑھانے کی کوئی تجویز زیرِ غور نہیں؟؟

کہانیاں یا افسانے کم از کم 5/4 تو ضرور ہوں ہر بار.....

خیر گھوریئے مت! کہ خود تو لکھتی نہیں اور افسانوں کی ڈیمانڈ کر رہی ہوں.....قلم کو کچھ ایسا زنگ لگا ہے کہ لکھنا بے حد دشوار ہو گیا ہے۔ کوئی عذر نہیں جو دے سکوں۔

یوم کشمیر کے حوالہ سے خاص مضمون نے بے حد متاثر کیا۔ کشمیر کے حوالے سے یہ موضوع اس سے قبل ہمارے مطالعہ سے نہیں گزرا تھا واقعی بہت ہی احساس ہوا۔ آنکھ سے آنسو بھی نکلے اور دل سے دعائیں بھی۔

نجمہ سہیل (کیا یہ سر سہیل احمد خان کی مسز ہیں پنجاب یونیورسٹی والے.....؟) کا افسانہ ''مقام کی تلاش'' زبردست ہے۔ لما تقولون مالا تفعلون کی بہت اچھی مثال، جس کا ہمارا معاشرہ دن بدن عادی ہوتا جا رہا ہے۔ (جی ہاں وہی ہیں!)

کاشفہ حسین کی ''اک نئی صبح'' سے یہ پیغام واضح ہوا کہ اگر دین سے صحیح تعلق جڑ جائے تو پھر انسان رشتوں میں ڈنڈی نہیں مار سکتا۔ بہت پسند آیا وقت کی ضرورت لگا۔ جب ہر طرف نفس پرستی کا چلن ہو وہاں ایسی تحریری روشن دیئے کی مانند ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز عمر نے ہمارے معاشرے کے جس بے رحم پہلو کی نشاندہی کی ہے وہ واقعی قابل توجہ ہے۔ جہاں ایک طرف عورتوں کو ہر طرح کی پابندیاں بالائے طاق رکھنے کا درس دیا جا رہا ہے، وہاں جائز حق پر بھی خاموش ہو کر خود کو روگ لگا لینا درست نہیں۔

''ترا آئینہ ہے وہ آئینہ'' کچھ حقیقت سے دور لگا..... عام روایتوں سے ہٹ کر۔ اسے پڑھ کر ہم نے دعا کی کہ اے اللہ! ہمارے معاشرے کو واقعی ایسی ہستیاں عطا کر دے جو اتنی محبت کرنے والی ہوں۔

آسیہ راشد کا ''نمایاں خواتین کا تذکرہ'' بہت اچھا ہے۔ پڑھا تو یہ سب ہوا ہے مگر ان جلیل القدر ہستیوں کو جب بھی پڑھیں نئے پن کا ہی احساس ہوتا ہے۔ اس سلسلہ کو جاری رکھیں ہمیں بہت پسند آیا ہے۔

دونوں ہلکے پھلکے کہیں سے بھی ہلکے پھلکے نہ تھے۔ ہلکا پھلکا کم از کم اس تحریر پہ صادق آتا ہے جو ہنسنے نہیں تو مسکرانے پر تو مجبور کر دے۔

''غذا اور صحت'' کے عنوان کے تحت پھلوں پہ مضمون بہت ہی پسند آیا۔ محترم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں درخواست ہے کہ مستقلاً ہم جیسے غافلوں کو کچھ نہ کچھ رہنمائی دیتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو زندگی، صحت، تندرستی اور ایمان کی سلامتی سے نوازے۔ آمین

ڈاکٹر شگفتہ نقوی کا مکتوب خاص پڑھ کر اپنے آپ پہ بہت افسوس ہوا کہ اگر اس شمارے میں ہماری بھی کوئی تحریر ہوتی تو ان کی شاباشی ہی حاصل ہو جاتی۔ خیر ''یار زندہ محبت باقی'' ہو سکتا ہے کہ ہمارا تبصرہ پڑھ کر ہی ہمیں ڈاکٹر صاحبہ کی شاباشی حاصل ہو جائے کہ قلم پکڑا حمیرا خدا خدا کر کے!

بتول میگزین بھی بہت اچھا تھا۔ مسز محمود کی تحریر اچھی لگی۔ ''خطبات'' پہ اپنے تبصرے کا موضوع بہت ہی پسند آیا۔ زبانی تو ہم اس کے اثرات کو اکثر ڈسکس کرتے ہیں تحریر میں لائیں تو کیا ہی اچھا ہو..... ہو سکتا ہے کہ میرے قلم کا جمود اس سے ہی ٹوٹ جائے۔ دعا کیجیے گا بہت۔ آپ کی صحت و سلامتی کیلئے بہت دعائیں۔

تیمیہ صبیحہ- راولپنڈی

میں ابھی دسمبر کے شمارے پر تبصرہ لکھ رہی تھی کہ جنوری کا شمارہ بھی آ وارد ہوا۔ خلافِ توقع آپ نے میرا مضمون جلد دے دیا۔ اس کی تمہید کے لحاظ سے میرا خیال تھا کہ آپ شاید مارچ میں دیں گی۔ بہرحال اس پر تبصرہ کرنا تو دیگر قارئین کا کام ہے۔

دسمبر کے شمارے کے متعلق چند امور۔

شمارہ پڑھتے ہی احساس ہوا کہ محرم کا سوگوار رنگ غالب ہے۔ خفتگانِ خاک میں اکٹھے تین مضمون تمام رسالے پر چھائے ہوئے تھے۔ اپنی اپنی جگہ ہر ایک خاصے کا تھا مگر باری باری دیتیں تو شاید رسالے کا مجموعی تاثر ماتمی نہ محسوس ہوتا۔ مریم گیلانی کا ''کاش وقت لوٹ آئے!'' میں نے بار بار پڑھا۔ دل سے لکھا ہوا، دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔ البتہ ایک بات کچھ نامناسب محسوس ہوئی،

''..... بوڑھی دادی کو خوش قسمت سے بدقسمت ہونے میں کچھ دیر نہ لگی.....''

ہم مسلمان موت اور آخرت کو حقیقی زندگی یا صوفیا کی زبان میں ''وصالِ یار'' سمجھتے ہیں۔ سورۃ الکہف میں اللہ تعالیٰ نے مومن والدین کے بچے کی موت کی جو حکمت بتائی ہے اس پر بھی ہمارا ایمان ہے کہ رب کائنات کا ہر فیصلہ مبنی بر حکمت ہے۔ بیٹی کا باپ سے جدائی کا دکھ بہت گہرا ہے اور اس کا اظہار مسنون بھی ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی قریبی اعزہ سے جدائی کے دکھ سے گزرے اور اس کا اظہار بھی کیا۔ ''آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں مگر لب پر وہی ہے جو رب کو پسند ہے۔''

''بدعات محرم'' موقع کی مناسبت سے مفید مضمون تھا۔ مگر یہ آپ کی ''خاص مضمون'' کی اصطلاح مجھے ہمیشہ کھٹکتی ہے۔ ''خاص بچے''، ''خاص امراض''، ''خاص ایام'' وغیرہ سی غیر ادبی بلکہ ''بے ادب'' تراکیب سے مماثلت لگتی ہے۔ آپ جیسی نفیس شاعرانہ ذوق کی حامل مدیرہ اس سلسلے کا کوئی بھلا سا عنوان کیوں نہیں رکھ لیتیں؟ اسی طرح ''میری لائبریری سے'' جیسے مفید اور دلچسپ سلسلے کے لیے بھی دل چاہتا ہے کہ کچھ عمدہ

سا نام ہو۔ ''لائبریری'' پڑھتے ہوئے زبان کی روانی اور سلاست برقرار نہیں رہتی۔ اس کے علاوہ کتاب کے ہمراہ اس کی قیمت بھی لکھی جائے تو یہ فیصلہ کرنے میں آسانی رہتی ہے کہ اپنے بجٹ میں اس خریداری کی گنجائش ہے یا نہیں۔

اس مرتبہ رمانہ عمر کو اس کالم میں دیکھ کے خوشی ہوئی۔ کچھ پرانی خوشگوار یادیں تازہ ہوگئیں اور دوسرا میرا جو مقالہ ان کے ماموں جان کی میز پر ہے، اس کا خیال آ گیا۔ ایسا ہی مزہ سعدیہ اکرام کی ڈاکٹر غازی کی خالہ سے ملاقات کی روداد پڑھ کے آیا تھا۔

محشر خیال/قارئین کے خطوط کی کمی بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ رسالے میں مدیرہ اور قارئین کے درمیان رابطے کے فقدان سے کچھ اپراہٹ سی لگتی ہے۔ اداریے میں حالاتِ حاضرہ پر وقیع تبصرے کے علاوہ اپنے رسالے یا قارئین کو مخاطب کیا جائے یا کہیں اور مثلاً خطوط اور ان کے جوابات ہوں تو اپنائیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ خطوط نہ ہوں تو ٹیلی فونی تبصروں، ای میل، زبانی ملاقاتوں ہی کو تحریر کر کے چھاپا جا سکتا ہے۔

نگہت عرفان.....کراچی

ماہنامہ بتول گزشتہ کئی برسوں سے زیر مطالعہ رہا ہے لیکن آج پہلی بار قلم اٹھا رہی ہوں اور اس کی وجہ ڈاکٹر بشریٰ تسنیم کی تحریر ''ترا آئینہ ہے وہ آئینہ'' (ماہ فروری) ہے۔ اللہ رب العالمین سے دعا گو ہوں کہ اللہ مصنفہ کو بہترین صحت کے ساتھ لمبی زندگی عطا فرمائے اور ان کے قلم و شعور میں مزید اضافہ فرمائے۔ (آمین).....اتنی پیاری اور منفرد تحریر پر مصنفہ کو اور ادارے کو جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ ان کی سوچ اور فکر کو اللہ اور بھی ترقی دے اور ایمان کی بہترین کیفیت عطا فرمائے۔ ''عمر مصطفیٰ'' اور ''ماریہ مصطفیٰ'' کے نام اور کردار کو جس خوبصورتی سے سوچا اور تحریر کیا ہے اس کے لیے اللہ رب العالمین ان کو بہترین اجر سے نوازے۔ (آمین)

''بتول'' مکمل طور پر ایک بہترین رسالہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب بہنوں کو اور خصوصاً پیاری مینا آپا کو اس کا بہترین اجر عطا فرمائے اور آپ سب کے حق میں اسے صدقہ جاریہ بنا دے۔ (آمین) سیما ملک کی ''ان سے ہی مجھے نسبت ہے مگر'' بھی بہت اچھی تحریر ہے۔ کاشفہ حسین ''اک نئی صبح'' بہترین کاوش تھی مگر پیاری کاشفہ! والدہ کو لے کر جانے کے بجائے دوسرا حل تلاش کرنا چاہیے تھا تاکہ جن کے پاس یہ حل نہ ہو وہ بھی صحیح راستہ کا انتخاب کر سکیں۔ ''نمایاں خواتین کا تذکرہ'' بہت ہی پیارا سلسلہ ہے اسے لازماً جاری رکھیے گا۔

انوار ربانی ''آغوش نبوت کی پروردہ ہستیاں'' عظمیٰ پروین کی بہت ہی خوبصورت تحریر تھی۔

''صلح حدیبیہ'' فریدہ خالد پڑھ کر ''فتح مبین'' کا تصور اور بھی واضح ہو گیا۔ ''قول نبیؐ'' بہترین سلسلہ ہے۔ ''نوائے شوق'' بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔

''محبت'' اور ''ترانہ کشمیر'' دونوں ہی بہت پسند آئیں۔ ''حقیقت اور افسانہ'' ''مقام کی تلاش'' نجمہ سہیل میں ''فخر خالہ'' کا کردار پسند آیا البتہ ''ہاجرہ بی'' کا اضافہ غیر ضروری محسوس ہوا۔ ''جرم ہے صنف نازک ہونا'' ڈاکٹر ممتاز عمر کی تحریر بہت اچھی تھی۔ ''عاشی'' کی موت کا بہت افسوس ہونے کے

ساتھ ساتھ پرویز کے کردار پر بھی بہت افسوس ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک بہت اہم مسئلہ کی طرف بہت ہی تہذیب کے ساتھ توجہ دلائی ہے۔

''آپ بیتی'' داستان عطا و بخشش پڑھ کر ایمان میں اور اضافہ ہوتا ہے۔

''ہلکا پھلکا'' بہت اچھا سلسلہ ہے مگر ''فرزانہ چیمہ'' کے ''چلتے چلتے'' کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت اور ایمان کی بہترین حالت میں رکھے۔ کیا قارئین سے کوئی شکایت ہے جو بار بار غائب ہو جاتی ہیں؟ آپ کے بغیر بتول ادھورا ادھورا سا لگتا ہے۔

''خفتگان خاک'' اپنے پیاروں کے بارے میں تاثرات کا سلسلہ بہت اچھا ہے اس طرح ہمارے پیاروں کے لیے بہت سے دعا کے ہاتھ اٹھ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ہم سب کے والدین کو صحت اور تندرستی اور ایمان کے ساتھ بہترین زندگی عطا فرمائے اور جو اس دنیا سے جا چکے ہیں انہیں بہترین جنت عطا فرمائے۔ (آمین)..... ''غذا اور صحت'' پھل، (خدا کی عظیم نعمت) سے استفادہ حاصل کریں۔

''بتول میگزین'' بہت اچھا لگا۔ ''حسن معاشرت'' طیبہ اکرام نے اہم جانب توجہ دلائی۔ ''گھر داری'' بہت اچھا اور معلوماتی سلسلہ ہے۔

''محشر خیال'' ڈاکٹر شگفتہ نقوی کے خیالات سے استفادہ حاصل کیا اور آخر میں ''اداریہ'' صائمہ اسما کی اس مختصر سی تحریر میں ہم پورے ماہ کی سیاسی و سماجی صورتحال سے باخبر ہو جاتے ہیں۔

اتنے اچھے اور پیارے رسالے کیلئے آپ کی پوری ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے۔

اللہ تعالیٰ ''بتول'' کو اور بھی کامیابیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

سارہ عدیل.....راولپنڈی

جنوری کا شمارہ ملا اداریہ بہت چشم کشا اور فکر انگیز تھا۔ خاص مضمون ''استحکام خاندان پر کاری ضرب'' اہم موضوع پر ہے۔ اک نئی صبح بہت سبق آموز اور حقائق کو غیر متعصب نگاہ سے دیکھنے کا داعیہ پیدا کرنے والا افسانہ ہے اس کی اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ مگر جس افسانے نے خاص طور پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ نصرت یوسف کا ''ملال'' تھا جس کو پڑھ کر واقعی ملال ہوا کہ اس میں تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھایا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ نرمی اور شفقت اسم اعظم کی طرح اکسیر ہیں اسی لیے آنحضرت محمدؐ سے بھی سورہ آل عمران میں فرمایا گیا.....

''(اے محمد) یہ تو آپ پر اللہ کا کرم ہوا ہے کہ آپؐ نرم خو پیدا کیے گئے ہیں اگر کبھی آپ تند خو اور سخت گیر ہوتے تو یہ لوگ آپ کے پاس سے چھٹ جاتے۔''

یقیناً نرمی و درگزر اچھے اخلاق کا اہم جزو ہے مگر کیا یہ ہمارا قومی مزاج نہیں کہ ہم دین کے معاملے میں ہر اس اصول و ضابطے کو نرمی و درگزر کا نام دے کر توڑ ڈالتے ہیں جس کو دنیا کے معاملے میں توڑنا محال ہے۔ اسکول کیلئے چاہے کتنی مشکل اٹھانی پڑے جبکہ قرآن کیلئے ہر طرح کی معذرتیں تیار رہتی ہیں اگر کسی قسم کی سختی کی جائے تو فوراً کہا جاتا ہے کہ اسلام تو نرمی کا

مذہب ہے اگر آپ سختی کریں گی تو بچے بھاگ جائیں گے۔ جبکہ دوسری طرف اس سے زیادہ سختی اور کام کا بوجھ بچوں کو سکول سے نہیں بھگاتا کیونکہ ہم خود ان کو ان ذمہ داریوں سے بھاگنے نہیں دیتے تو آخر اللہ کی کتاب ہی نعوذ باللہ اتنی ارزاں ہے کہ اس کے معاملے میں ہر اصول وضابطہ نظر انداز کیا جائے اور انہیں اپنی مجبوریوں کی بھینٹ چڑھایا جائے۔ افسانے کا پلاٹ عمدہ تھا لیکن تصویر کے دونوں رخ پیش کیے جاتے تو زیادہ مؤثر ہوتا۔

رشیدہ کفایت اللہ-فیصل آباد

بتول ہر ماہ باقاعدگی سے ملتا ہے معیار بلند دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔اداریہ تو خاص طور پر بہت اثر انگیز ہوتا ہے۔ صائمہ بیٹی کے لیے بہت دعائیں، اللہ تعالیٰ پرچے کو ترقی دے۔(ٹیلی فون پیغام)

نصرت یوسف-کراچی

ابھی جنوری کے شمارے میں تیمیہ صبیحہ کی تحریر اپنے والد کی یاد میں پڑھی ہے میرے پاس تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔پکاسو کی تخلیق کی طرح یہ ایک تحریری آرٹ ہے۔(SMS)

عافیہ رحمت-کراچی

جنوری ۲۰۱۲ء کا شمارہ جلد مل گیا۔افسانے سب ہی اچھے تھے۔'ملال' پڑھ کر ہم نے دل میں یہ عہد کیا کہ ہر حال میں خوش اخلاقی کو اپنانا ہے۔ تیمیہ صبیحہ کے جذبات بے حد متاثر کن تھے۔ تیمیہ باجی! پلیز آپ لکھتی رہا کریں۔دل کو سکون مل جاتا ہے ایسی جاندار تحریر پڑھ کر۔ پکوان اور تربیتِ اطفال ہمارے پسندیدہ سلسلے ہیں کیونکہ آج کل انہی امور نے آدھا کر دیا ہے۔بتول کی ترقی کے لیے دعا گو۔(SMS)

☆''احسن تقویم'' کی طرف سے ایک مضمون ''محمد بن قاسم'' موصول ہوا ہے۔لکھنے والے کا مکمل پتہ اور فون نمبر درج نہیں ہے اور تاریخی واقعے کا حوالہ بھی موجود نہیں ہے۔ برائے مہربانی فون پر رابطہ کریں۔

صحت مند زندگی کیسے

کھانے کے اصول وآداب

۱-متوازن غذا:

متوازن غذا وہ ہے جس میں غذائیت کے تمام اجزاء مناسب مقدار میں شامل ہوں، یعنی نشاستہ، روغنیات، لحمیات، حیاتین اور نمکیات وغیرہ۔ یہ سب چیزیں مختلف غذاؤں سے حاصل کی جاسکتی ہیں یعنی روٹی، چاول، گوشت، مرغ، انڈے، مچھلی، پھل، سبزیاں، دالیں، میوہ جات، شکر اور نمک وغیرہ۔ سبزیوں میں اہم چیز ریشے والی سبزیاں ہیں جن میں کدو، ٹینڈے، پھول گوبھی، بند گوبھی، پالک، ساگ، شلجم، بھنڈی، توری، سلاد، کھیرے، ککڑی، مولی، پھلیاں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ خوراک میں ان کی مناسب مقدار کی شمولیت سے کئی بیماریوں خصوصاً بڑی آنت کے کینسر سے بچا جا سکتا ہے۔ روغنیات کی زیادتی بھی کئی بیماریوں کا سبب بنتی ہے۔ اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

۲-کھانے میں اعتدال اور بسیار خوری سے پرہیز:

انسانی جسم کو روزمرہ کی کارکردگی کے لیے قوت کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے خوراک سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر جسم کی ضرورت سے زیادہ خوراک کھائی جائے تو جسم میں چربی کی شکل میں جمع ہونے لگتی ہے اور انسان موٹاپے کا شکار ہو جاتا ہے جو کئی امراض کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ بھوک رکھ کر کھانے کی عادت ڈالنی چاہیے اور وقت بے وقت کھاتے رہنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کے لیے چند لقمے ہی اس بات کے لیے کافی ہیں کہ اس کی کمر سیدھی رہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ انسان کو چاہیے کہ اپنے معدہ کے تین حصے کرے، ایک ٹھوس غذا کے لیے، ایک پانی کے لیے اور ایک حصہ (ہوا کے لیے) خالی رہنے دے تاکہ سہولت سے سانس لے سکے۔ ایک اور موقع پر آپؐ نے اچھی صحت کا راز بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ہم وہ قوم ہیں جو اس وقت تک نہیں کھاتے جب تک ہمیں بھوک نہ لگے اور جب کھاتے ہیں تو پیٹ بھر کر نہیں کھاتے۔'' قرآن کریم میں سورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''کھاؤ اور پیو لیکن حد سے تجاوز نہ کرو۔''

۳-کھانا کھانے کے بعد آرام کی ضرورت:

کھانا کھانے کے بعد خون کا زیادہ بہاؤ معدہ کی طرف ہو جاتا ہے اور دوسرے اعضاء اور دماغ کی طرف یہ بہاؤ نسبتاً کم ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں فوراً چلنا پھرنا شروع کر

دینا، ورزش کرنا یا کوئی اور مشقت کا کام کرنا دل کے دورہ کا سبب بن سکتا ہے۔اس سے بچاؤ کے لیے ہمیں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے معمول پر عمل کرنا چاہیے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ آرام فرماتے تھے۔اس کے بعد روزمرہ کے کام سرانجام دیتے تھے۔

۴-کھانا کھانے کا طریقہ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرتے۔آپؐ نے فرمایا کہ جس کھانے پر بسم اللہ نہ پڑھی جائے اس میں شیطان شریک ہو جاتا ہے۔کھانا کھانے کے بعد آپ یہ دعا پڑھتے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ.

''سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے کھلایا، پلایا اور مسلمان بنایا۔''

آپؐ نے فرمایا کہ کھانا کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونا باعث برکت ہے۔اس کا طبی فائدہ یہ ہے کہ ہاتھ جراثیم سے پاک ہو جاتے ہیں اور جراثیم خوراک کے ساتھ معدہ میں نہیں جاتے، اور کھانا کھانے کے بعد ہاتھوں کو لگے غذا کے ذرات ہاتھ دھونے سے صاف ہو جاتے ہیں اور ان پر جراثیم نہیں پلتے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے داہنے ہاتھ سے کھانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اپنے سامنے سے کھاؤ۔آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب کھانا سامنے رکھ دیا جائے تو اپنے جوتے اتار دیا کرو اس سے تمھارے پاؤں کو راحت ملے گی۔آپؐ نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ کھانے کے بعد انگلیاں چاٹ لیا کرو اور برتن صاف کر لیا کرو۔(یعنی کھانا پلیٹ میں بچا نہیں رہنا چاہیے) کہ تمھیں نہیں معلوم کہ کھانے کے کس حصے میں برکت ہے۔آپؐ کبھی ٹیک لگا کر نہیں کھاتے تھے کہ یہ متکبرانہ انداز ہے۔اسی طرح آپؐ کسی کھانے میں عیب نہیں نکالتے تھے۔اگر مرغوب ہوتا تو کھا لیتے، مرغوب نہ ہوتا تو چھوڑ دیتے۔

۵-زیادہ گرم کھانا نہ کھائیں:

زیادہ گرم کھانا منہ اور خوراک کی نالی میں زخم پیدا کر سکتا ہے۔اس لیے تیز گرم کھانے اور مشروبات کی تیزی مناسب حد تک کم کر لینی چاہیے۔حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کا طریقہ تھا کہ جب ان کے پاس ثرید پکا کر لائی جاتی تو وہ اسے اس وقت تک ڈھکا رہنے دیتیں جب تک اس کی گرمی اور جوش ختم ہو جاتا۔وہ فرماتی تھیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اس طرح کھانا زیادہ برکت کا باعث ہوتا ہے۔

۶-گرم کھانے کو پھونک سے ٹھنڈا کرنا:

اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ گرم کھانا یا چائے وغیرہ پیتے وقت وہ اسے بار بار پھونک مار کر ٹھنڈا کرتے جاتے ہیں۔اس طریقہ سے ہماری سانس کی نالی سے خارج ہونے والے جراثیم کھانے یا مشروب میں شامل ہو کر بیماری پیدا کرتے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے یا مشروب پر پھونکنے سے منع فرمایا۔لہٰذا ہمیں اس غیر صحت مند عادت

سے گریز کرنا چاہیے تاکہ بیماری سے بچ سکیں۔

۷- پانی پینے کا طریقہ:

کھڑے ہو کر اور ایک سانس میں پانی پینا صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ صحیح طریقہ جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا وہ یہ کہ آرام سے بیٹھ کر اللہ کا نام لے کر تین سانسوں یا وقفوں میں پانی پئیں۔

۸- خوراک میں صرف حلال چیزوں کا استعمال:

جسمانی صحت اور اخلاقی صحت دونوں کے حوالے سے اسلام کے حلال وحرام کا بڑا تعلق ہے۔ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ صحت کے لیے ہر لحاظ سے مضر ہیں۔ مثلاً سور کا گوشت انتہائی مہلک بیماری کا باعث بن سکتا ہے۔ شراب سے کئی بیماریاں جنم لیتی ہیں جن میں معدہ کا السر، دل اور گردوں کا متاثر ہونا، جگر کا سکڑنا اور سرطان اور بلڈ پریشر کی زیادتی وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح جو چیزیں اسلام نے مکروہ قرار دی ہیں اُن کے کھانے میں بھی ضرر ہے لہٰذا ان سے بھی پرہیز بہتر ہے۔

۹- بغیر چھنے آٹے کی روٹی کا استعمال:

آج کل ہم لوگ چھنے ہوئے سفید آٹے کی روٹی و ڈبل روٹی کھانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اس سے قبض، بڑی آنت کا سرطان، بلڈ پریشر، دل کی بیماریاں اور سر درد کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ جبکہ بغیر چھنے آٹے کی روٹی میں ایک طرف تو غذائیت زیادہ ہوتی ہے تو دوسری طرف اس میں بورے کا ریشہ ہونے کی وجہ سے یہ فاسد مادوں کو معدہ میں جمع نہیں ہونے دیتا۔ لہٰذا اس کے استعمال سے انسان کئی مہلک بیماریوں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر کبھی بھی چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائی۔

۱۰- حاملہ اور دودھ پلانے والی ماؤں کی غذا:

حمل اور رضاعت کے دوران جہاں ماں کی غذائی ضروریات کا خیال رکھنا اور اسے متوازن غذا مہیا کرنا ضروری ہے وہاں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اُسے ضرورت سے زیادہ کھلا پلا کر موٹاپے کی طرف مائل نہ کر دیا جائے۔ ہماری معاشرت میں یہ بات شامل ہے کہ حمل اور رضاعت کے دوران عورتوں کے لیے خاص غذائیں تیار کی جاتی ہیں جن میں گھی اور شکر کا بے محابا استعمال ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اچھی بھلی صحت مند لڑکی پہلے ہی حمل کے دوران موٹاپے کا شکار ہو جاتی ہے جو عمر بھر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ موٹاپے کی وجہ سے نہ صرف خواتین اپنا نسوانی حسن کھو بیٹھتی ہیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف بیماریوں میں بھی مبتلا ہو جاتی ہیں۔

بتول میگزین

ویلن ٹائن ڈے

(ام صفیہ)

یوم محبت رومی بت پرستوں کے تہواروں میں سے ایک تہوار ہے جبکہ رومیوں کے ہاں بت پرستی سترہ صدیوں سے زیادہ مدت سے رائج تھی اور یہ تہوار رومی بت پرستی کے مفہوم میں حب الٰہی سے عبارت ہے۔

جب رومی بت پرستوں نے نصرانیت قبول کی تو تیسری صدی عیسوی میں رومی بادشاہ کلاوَدیس دوم نے اپنی فوج کے لوگوں پر شادی کرنے کی پابندی لگا دی کیونکہ وہ بیویوں کی وجہ سے اس کے ساتھ جنگوں میں نہیں جاتے تھے۔ لیکن سینٹ ویلنٹائن (جو کہ ایک پادری تھا) نے اس فیصلہ کی مخالفت کرتے ہوئے چوری چھپے فوجیوں کی شادی کروانے کا اہتمام کیا، اور جب کلاودیس کو اس کا علم ہوا تو اس نے ویلن ٹائین کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا اور اسے پھانسی کی سزا سنا دی۔ کہا جاتا ہے کہ قید کے دوران ہی سینٹ ویلن ٹائن کو جیلر کی بیٹی سے محبت ہو گئی اور یہ سب بھی خفیہ ہوا کیونکہ عیسائیت میں پادریوں اور راہبوں کا عورت کی طرف مائل ہونا اور شادی کرنا حرام ہے۔ جب بادشاہ کو اس حرکت کا علم ہوا تو اس نے فوراً پھانسی کے انتظام کا حکم دیا۔ چنانچہ چودہ فروری ۲۷۰ء میں ویلن ٹائن کو پھانسی دے دی گئی۔ عیسائیت میں اس رات کو پاکباز شب قرار دیا گیا۔ وہ لڑکی اور پادری پھولوں اور کارڈز سے اظہارِ محبت کرتے تھے۔ اس لیے اس دن نام نہاد محبت میں گرفتار جوڑے ایک دوسرے کو سرخ پھول اور کارڈ دیتے ہیں اور بطور خاص سرخ لباس پہنتے ہیں۔

☆☆☆

اللہ خوبصورت ہے خوبصورتی کو پسند کرتا ہے

(آسیہ عمران)

''اللہ خوبصورت ہے'' اس سے کسی کو انکار نہیں۔ کوئی انکار کر بھی کیسے سکتا ہے؟ کہ یہ دنیا کے سب سے سچے انسان نے کہا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی فرمایا ''وہ خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔'' یہ دو جملے کیا ہیں کہ جنھوں نے میری زندگی کو ہلا دیا ہے۔ بے چینی سی بے چینی ہے جو گزرے ماہ وسال کو گھیرے میں لیے کھڑی ہے۔ میں خود بھی خوبصورت ہوں، خوبصورت چہرے ہی مجھے اچھے لگتے ہیں۔ عام چہرے مجھے کبھی متاثر نہیں کرتے۔ بچپن سے لے کر اب تک حلقہ رفاقت میں گنے چنے لوگ ہی رہے۔ اور ان رفاقتوں کی واحد وجہ متاثر کن خوبصورتی رہی۔ بہن بھائیوں سے بھی کبھی قربت نہیں رہی کہ عام نین نقش مجھے اپیل نہیں کرتے۔ البتہ میری ماں

بہت خوبصورت ہے۔ اتنی کہ جب شعور کی آنکھ کھلی تو میں اپنی ماں کو گھنٹوں تکا کرتی۔ میری محویت دیکھ کر ماں بول پڑتی۔ کیا ہے زجاجے۔ کیوں دیکھتی جارہی ہو۔ ٹھیک تو ہو؟ وہ مجھے سینے سے لگا کر بھینچ لیتیں۔ میری محویت پھر بھی نہ ٹوٹتی۔ نہ جانے کیوں میری نگاہیں انھی کا حصار کیے رکھتیں۔

ڈھائی سال میں ہی مجھے اسکول داخل کروا دیا گیا۔ مگر تین سال میری کسی سے دوستی نہ ہو پائی۔ کلاس ٹو کا فرسٹ ڈے تھا۔ عافیہ جیسے کلاس میں آئی۔ میری نگاہیں ٹک سی گئیں۔ اور پھر بہت جلد میری اس سے دوستی ہو گئی۔ وہ میرے خوبصورتی کے پیمانے پر فٹ آئی تھی۔ ہر خوبصورت چیز میری ڈیمانڈ بنتی جارہی تھی اور وہ چیز میری دسترس میں آ بھی جاتی۔ یوں میں عادی ہوتی چلی گئی۔ ہر خوبصورت چیز میری اور صرف میری تھی۔

گزرے ماہ و سال میں پتہ ہی نہ چلا بچپن، لڑکپن کے مراحل کب گزرے۔ اور پھر شادی ہو گئی۔ احسن کو پا کر میں بہت خوش تھی۔ وہ واقعی احسن تھا۔ حسن میں احسن، سیرت و کردار میں احسن اور اب میں امید سے تھی۔ ایک خوبصورت سے بچے کا تصور چہرے پر تازگی بکھیر دیتا۔ انھی دنوں عافیہ پاکستان آئی۔ پورے پندرہ سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔ وہ پہلے سے بھی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ بلیک اسکارف میں ایک نور سا تھا جو ملکوتی حسن دے رہا تھا۔ اس کا سسرال میرے گھر کے قریب ہی تھا۔ وہ کچھ سالوں سے اپنے میاں کے ساتھ سوڈان میں تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ واپس جانے کو تیار تھی۔ جاتے جاتے اس نے درس قرآن کی دعوت دی، میں گھر میں فارغ ہی تھی مگر پھر بھی وقت مقررہ سے کچھ تاخیر ہو گئی۔ کمرہ خواتین سے بھرا تھا۔ داخل ہوتے ہی میں سرتاپا کان بن گئی۔ وہ جملہ تھا ہی ایسا ..... اللّٰہ جمیل ویحب الجمال۔ اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ وہیں سفید چاندنی پر میں بیٹھتی چلی گئی۔ انوکھی سی محبت تھی جو اس پل اس ذات کے لیے دل کے نہاں خانوں میں در آئی تھی جو خود بھی خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔

میں محو سماعت تھی اور عافیہ کہہ رہی تھی۔ اللہ خوبصورت ہے۔ اللہ خوبصورت ہے حد درجہ خوبصورت۔ مگر کیسے؟؟ کیا کسی نے اللہ کو ان نگاہوں سے دیکھا ہے۔ نہیں ..... یقیناً نہیں..... تو پھر اللہ کی خوبصورتی کا ہمیں کیسے پتہ چلا..... بات سادہ سی ہے۔ اللہ نے قرآن کریم میں اپنی تصویر اتاری ہے۔ تصویر ذات نہیں۔ تصویر صفات، وہ رب ہے، رحمٰن ہے، وہ رحیم ہے، وہ غفار ہے، وہ قدوس ہے، مہیمن ہے، الودود ہے، السلام..... وغیرہ ہے۔ ان صفات میں اس کی خوبصورتی ہے۔ جسے ایک روشن دل ہی دیکھ سکتا ہے۔ اللہ پسند کرتا ہے۔ یہی خوبصورتی اس کے بندے بھی اخذ کریں۔ کیونکہ وہ خوبصورتی کو پسند بھی کرتا ہے۔ پھر وہ زمانہ اور آج تک لوگ خوبصورتی اخذ کر رہے ہیں اور تاریخ ان کی خوبصورتیوں پر محو حیرت ہے۔ حضرت بلالؓ خوبصورت ہیں، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ یہ خوبصورت ہیں کہ ان کی سیرت کی خوبصورتی آج بھی شمع کی صورت ہمارے دلوں اور عملوں میں روشن ہے۔ اس سے بڑھ کر خوبصورتی کیا ہو گی کہ ہزاروں سال بعد بھی ہم ان کے گرویدہ ہیں اور تا قیامت یہ

خوبصورتی برقرار رہے گی۔

میری پیاری بہنو! ہم بھی خوبصورت بن سکتے ہیں ۔ طریقہ ہمیں بھی وہی اختیار کرنا ہوگا۔ رب کریم کی صفات کو اپنانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ وقت مختصر ہے میں صرف ایک مثال دیتی ہوں ۔اللہ کی ایک صفت ''رب'' ہے جس کے معنی پالنے والا، ضروریات بہم پہنچانے والا، تربیت کرنے والا، نشوونما کرنے والا، خبر گیری کرنے والا۔

قرآن کریم مین رب کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ میں چند آیات کا حوالہ دیتی ہوں ۔قرآن کریم میں سورۃ یوسف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔''اس نے کہا پناہ بخدا وہ تو میرا رب ہے۔جس نے مجھے اچھی طرح رکھا۔''

سورۃ الشعراء میں ارشاد ہے: ''تمھارے یہ معبود تو میرے دشمن ہیں۔ بجز رب کائنات کے جس نے مجھے پیدا کیا۔ جو میری رہنمائی کرتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔''

سورۂ نحل میں ہے:''وہ تم سے مصیبت کو ٹال دیتا ہے۔''

اگر ہم چاہتی ہیں کہ ہم خوبصورت بنیں تو ہمیں دوسروں کی تربیت کرنی ہوگی۔ خبر گیری کرنی ہوگی۔ ضروریات بہم پہنچانی ہوں گی۔ پریشانیوں کو بانٹنا ہوگا۔ ہر لمحہ اصلاح کی فکر کرنی ہوگی۔ تبھی خوبصورتی کے سوتے ہمارے اندر سے پھوٹیں گے اور یہ خوبصورتی دوامی ہوگی، گہری ہوگی۔ جس کی جڑیں دلوں میں ہوں گی دلوں کو مسخر کرے گی۔ حضورؐ اپنی زندگی کے ابتدائی چالیس سال میں کیا کرتے رہے؟ وہ ربوبیت کر رہے تھے۔ پریشانیاں دور کرتے، بوجھ اٹھاتے تھے، شفیق تھے، بھٹکوں کو راستہ دکھاتے۔ پیاسوں کو پانی پلاتے، حاجت روائی کرتے۔ یہ تھی وہ خوبصورتی جس نے دلوں کو روشن کیا۔ یہی ہے اصل خوبصورتی جو اللہ میں بدرجہ اتم موجود ہے اور انسان اللہ کی ان صفات سے اخذ کرتا ہے اور ..... میرا دل پھٹنے لگا تھا۔ خود احتسابی کا عمل ایسا ہی کٹھن ہوتا ہے۔ میں نے کن خوبصورتیوں میں عمر گنوادی؟؟؟

آخر ایک فیصلہ کر ہی لیا۔ خوبصورت ہونے کا فیصلہ..... میری خوش قسمتی نے یہ فیصلہ کروا ہی لیا تھا۔ تو اب میں بے چینی سے اس کے حصول کی جستجو میں تھی اور یہ بے چینی تو بڑی ہی مبارک تھی.....

☆☆☆

جمعۃ المبارک اور ہم

(مریم شہزاد- کراچی)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے جمعہ کا دن مبارک قرار دیا ہے ہر قوم کے لیے ہفتے کا ایک دن، عبادت کے لیے مختص کیا گیا اسی طرح مسلمانوں کے لیے بھی ۔اللہ تعالیٰ نے سورۂ جمعہ میں فرمایا ہے:

''اے ایمان والو! جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کے لیے اذان کہی جائے تو تم اللہ کی یاد (یعنی نماز وخطبہ) کی طرف (فوراً) چل پڑا کرو اور خرید وفروخت چھوڑ دیا کرو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو۔''

اے ایمان والو! کہہ کر یہ حکم صرف مردوں کے لیے ہی نہیں دیا گیا بلکہ اس میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ جو مرد وخواتین شاپنگ کے دلدادہ ہیں وہ جمعہ کے دن بھی خریداری کے لیے

نکل پڑتے ہیں جبکہ جمعہ کا وقت بیچ میں پڑتا ہو۔

یہ وہ دن ہے جس دن زیادہ سے زیادہ درود پاک پڑھنے، صلوٰۃ تسبیح پڑھنے اور غسل اور وضو کی فضیلت آئی ہے۔ جمعہ کے وقت شاپنگ سینٹرز میں جو رش نظر آتا ہے وہ انتہائی شرمناک ہے ایسے وقت میں خریداری کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے منع ہے ہمیں سوچنا چاہیے بنی اسرائیل کے لیے ہفتے کا دن عبادت کے لیے مقرر تھا مگر انھوں نے نافرمانی کی اور عذاب کے مستحق ٹھہرے۔ ذرا سوچیے آج کل ہم بھی کتنی سزاؤں کی لپیٹ میں ہیں اور اس کو حکومت کی نااہلی کہہ کر ٹال جاتے ہیں مگر سزا بھگت رہے ہیں اور سمجھ نہیں رہے کہ یہ اللہ کی طرف سے سزائیں ہیں، پہلے صرف بجلی کی لوڈ شیڈنگ تھی اب گیس کی بھی شروع ہوگئی۔ CNG بند، پٹرول مہنگا، آٹا، دال، گوشت، سبزی۔ کوئی چیز عام آدمی کی پہنچ میں نہیں۔ اور اوپر سے آئے دن کی لوٹ مار کوئی پوچھنے والا نہیں یہ سب نافرمانی کی سزائیں نہیں تو اور کیا ہیں۔ آخر سوچیے یہ Sale اتوار کو کیوں نہیں لگتی اس دن اپنا آرام، اپنی نیند اللہ کے حکم سے زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ عورتوں کو بھی اس دن اپنا شوہر اور اپنے بچے وقت مانگتے نظر آتے ہیں۔ مجازی خدا کی اہمیت ہے پر خدائے واحد کی؟ کوشش کریں جن جن نافرمانیوں سے بچ سکتے ہیں بچ جائیں۔ کیونکہ مستقبل میں قوم کے معمار ہمیں ہی بنانے ہیں۔ بیٹے ہوں یا بیٹیاں، ہیں تو ہمارے ہی بچے دونوں والدین سے سیکھتے ہیں اس لیے انھیں جمعے کی اہمیت ابھی سے آگاہ کیجیے۔

☆☆☆

خوش رہنے کا فن سیکھیے

(عظمیٰ آفرین۔ کراچی)

زندگی میں بہت دکھ، درد، غم اور اداسیاں سہی، مگر زندگی خوبصورت بھی تو ہے۔ خوشیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے بھی تو اسی زندگی کا حصہ ہیں۔ تو کیوں نہ آج ہم زندگی میں موجود خوشی کے عنصر پر بات کریں۔

خوشی کی تعریف کئی لوگوں نے کی اور سب نے اپنے اپنے انداز سے کی۔ اپنے اپنے آئینے سے زندگی میں خوشی کے رنگ کو دیکھا۔ کچھ لوگوں کے نزدیک بڑی گاڑی، بنگلہ اور بہت سا بینک بیلنس ہی خوشی ہے..... مگر ڈھیروں خوشیاں ایسی بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیسے اور دولت کی تقسیم سے الگ عطا کی ہیں۔ اگر خوشی صرف پیسے ہی کا نام ہے تو پھر چھوٹے گھروں اور گنے چنے پیسوں والے کبھی خوشی کا منہ نہ دیکھ پاتے۔ مگر ایسا نہیں ہے..... یہ زندگی ان کے حصے کی خوشیاں ان کے دامن میں ضرور ڈالتی ہے۔

کہتے ہیں جس دن آپ اداس ہوں، اس دن کسی بچے کو آئس کریم کھاتا دیکھ لیں۔ خوشی ننھے بچے کی مسکراہٹ میں بھی ہے،۔ ہمارا کام مکمل ہونے پر بھی ہے، کسی کو مسکراہٹ دینے میں بھی ہے، دن بھر کے تھکا دینے والے کام کے بعد فرصت کا ایک لمحہ بھی ہے، کوٹ کے اندرونی جیب سے اچانک سو روپے کا نوٹ مل جانا بھی ہے، کسی چھوٹی سی خواہش کے پورا ہونے پر بھی ہے، کسی دوسرے کے کام آنے میں جو خوشی ہے وہ سب سے بڑھ کر ہے۔ غرض کہ خوشی ہر اس چیز میں شامل ہوتی ہے جو

ہمارے اردگرد ہوتی ہے۔ بس ہمیں صرف اسے محسوس کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اپنے اپنے سفر پر روانہ زندگی میں مصروف بیٹے بیٹیاں، جب اپنے بوڑھے والدین کے قدموں میں کچھ لمحے گزارتے ہیں اوران کی چھاؤں میں پھر سے خود کو ننھا بچہ تصور کرتے ہیں، تو والدین اور بچوں کو یہ لمحے بھی خوشی کا انمول احساس دلاتے ہیں، جسے شاید کسی زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب ایک شیر خوار بچہ لڑکھڑاتے ہوئے اپنا پہلا قدم اٹھاتا ہے تو والدین کے لیے اس خوشی کا نعم البدل نہیں ہوتا۔ ہفتے بھر کے کام کے اوقات میں اچانک کسی چھٹی کا آ جانا، کبھی کسی پرانے پرس میں سے کسی ایسی چیز کا مل جانا جو ہم کافی دنوں سے ڈھونڈ رہے ہوں، موبائل پر ہماری پرانی دوست کا SMS یا کال کا آ جانا، کسی کا ہماری چھوٹی سی بات کو مان لینا یا کسی کا ہمارے حق میں بات کر دینا ہمیں خوشی کا وہ احساس دیتا ہے جس سے ہم کئی دن پر مسرت گزارتے ہیں۔

خوشیاں ایسے موتی کی مانند ہوتی ہیں جنھیں تلاش کرنے کے لیے انسانوں کو زندگی کے سمندر میں چھلانگ لگانا پڑتی ہے ،کبھی تو انسان اسے پالیتا ہے اور کبھی سمندر کی وسعتوں میں کھو کر غموں کی وادی میں گم ہو جاتا ہے۔ خوشیاں غریب انسان کے لیے شوکیس میں سجے ہوئے کھلونے کے مانند ہیں جنھیں وہ چھو نہیں سکتا۔ انھیں دیکھ تو سکتا ہے مگر پا نہیں سکتا۔ ایسی صورت میں کسی غریب کو خوشیاں دے کر ہم اپنے لیے خوشیاں حاصل کر سکتے ہیں۔

خلیل جبران کا کہنا ہے: ''اگر تم نے ہر حال میں خوش رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے تو یقین کرو زندگی کا سب سے بڑا فن سیکھ لیا۔ اللہ کی شکر گزاری کے احساس کے ساتھ اپنے شب و روز کو دیکھیں تو سیکڑوں ہزاروں خوشیاں ہماری زندگی کو حسین بنا رہی ہوتی ہیں صرف محسوس کرنے کی بات ہے۔ دل اداس ہو تو کھلتے ہوئے شوخ و شنگ رنگ بھی، ہمارے دل کو خوشی کے احساس سے بھر سکتے ہیں تو پھر کیوں نہ ہم زندگی میں خوش رہنے کا فن سیکھ لیں اور جب اداس ہوں تو کسی ایک رنگ و انداز کو اپنا لیں۔

☆☆☆

مس کال

ریحانہ عبدالمقتدر خان۔ دہران

گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے جب اس کا سیل فون تیسری بار بجا تو اس نے جیب سے نکال کر نمبر دیکھا۔ جب تک فون بند ہو چکا تھا۔

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ارے یہ تو باس کا فون تھا۔

اس نے سوچا گھر جا کر اطمینان سے بات کروں گا۔ مگر گھر پہنچ کر وہ کچھ اس طرح مصروف ہوا کہ باس کو کال کرنا ہی بھول گیا۔

اگلے دن جب وہ آفس پہنچا تو ٹرمینیشن لیٹر اس کی ٹیبل پر اس کا منتظر تھا جسے دیکھ کر وہ انتہائی پریشان ہو گیا کہ کتنی مشکل اور جانفشانی کے بعد تو یہ جاب ملی تھی، اب وہ بھی ہاتھ سے گئی۔

اس نے دل ہی دل میں باس سے ملنے کا فیصلہ کیا کہ آخر اس سے پوچھنا تو چاہیے کہ اس نے کس قصور کی وجہ سے مجھے

ٹرمنیٹ کیا ہے۔

اس کے قدم آہستہ آہستہ باس کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔اجازت ملنے پر وہ اندر داخل ہوا۔اس کے ہاتھ میں ابھی بھی ٹرمنیشن لیٹر تھا جس کے بارے میں وہ ان سے بات کرنا چاہتا تھا۔

باس نے اس کو دیکھتے ہی غصے سے کہا''کل تم کہاں تھے میں نے تمھیں اتنی کالز کیں مگر تم نے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ مجھے تم سے انتہائی ضروری کام تھا، کام تو خیر میرا ہو گیا مگر مجھے ایسے ملازم کی کوئی ضرورت نہیں ہے جو میری کال پر فوراً حاضر نہ ہو۔تم اب جا سکتے ہو۔ مجھے تمھاری کوئی کہانی نہیں سننی ہے اور اپنے بقایا جات لیتے جانا۔''

باس نے بات ہی ختم کر دی تھی اب کہنے سننے کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ وہ بے جان قدموں سے آفس سے باہر آیا۔ اسے ظہر کی اذان سنائی دی۔ آج یہ آواز اس کے دل میں اتری جا رہی تھی۔ حالانکہ وہ روز ہی دن میں کئی بار یہ آواز سنتا تھا۔مگر کوئی توجہ دیے بغیر اپنے کاموں میں لگا رہتا۔مگر آج بالکل غیر ارادی طور پر اس کے قدم مسجد کی طرف اٹھ گئے۔

باس کے کہے ہوئے الفاظ ایک تسلسل سے اس کے دماغ میں گونج رہے تھے اور خاص طور پر یہ ایک جملہ''میں ایسے ملازم کو نہیں رکھ سکتا جو میری کال پر فوراً حاضر نہ ہو۔''

وہ سوچ رہا تھا کہ میں نے اپنے خالق اور مالک کی کتنی کالیں ڈسکنیکٹ کیں اور انھیں ہر بار نظر انداز کر دیا۔کیسی کیسی ناشکری اور نافرمانی کی مگر اس رحیم و کریم رب نے مجھے اپنی دنیا سے نہیں نکال دیا بلکہ ہر بار موقعہ دیا کہ میں شاید اب بھی پلٹ آؤں۔

میری آنکھوں نے ایک دفعہ بھی دیکھنا بند نہیں کیا، نہ میرے کانوں نے سننا بند کیا۔ دل بھی اسی طرح چل رہا ہے، ہاتھ پاؤں بھی بالکل ٹھیک طرح کام کر رہے ہیں۔

اگر وہ میرا رب چاہتا تو سیکنڈوں میں مجھ سے یہ ساری صلاحیتیں چھین سکتا تھا مگر یہ اس کی رحمت ہی تو ہے کہ اس نے اتنی نافرمانیوں کے باوجود بھی مجھ سے میری کوئی صلاحیت نہیں چھینی، اگر وہ ان میں سے کچھ بھی لے لیتا تو میں اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتا تھا۔

اس کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

آج اس کی سوچ کے زاویے بدل گئے تھے اور وہ انہی سوچوں میں غرق شرمندہ سا مسجد میں داخل ہوا اور اپنے رحیم و کریم رب کے آگے بے اختیار سجدے میں جھکتا چلا گیا کہ اس ارحم الراحمین نے اسے پلٹنے کا ایک اور موقعہ فراہم کر دیا تھا۔

☆☆☆

کچن کارنر

سرمئی مچھلی

اشیا: سرمئی مچھلی ایک کلو، لیموں 4 عدد، ہلدی ایک کھانے کا چمچ، اجوائن ¼ چائے کا چمچ، بھنا سفید زیرہ ایک چائے کا چمچ (پیس لیں)، لال مرچ پسی ہوئی ایک کھانے کا چمچ، گرم مصالحہ پسا ہوا، ایک چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، انڈے 2 عدد، ثابت دھنیا (موٹا کٹا ہوا) ایک چائے کا چمچ، ادرک لہسن (پیسٹ) ایک کھانے کا چمچ، بیسن ایک کھانے کا چمچ، کارن فلور دو کپ، تیل تلنے کے لئے۔

ترکیب: مچھلی صاف کر کے اس کے ٹکڑے کر لیں۔ اب اس میں لیموں کا رس لگا دیں۔ اب تمام مصالحے، انڈے، ادرک لہسن اور بیسن، یہ تمام اشیاء مچھلی پر لگا دیں۔ کارن فلور کے علاوہ۔ اب یہ مچھلی دو سے 3 گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔ اب گھی گرم کریں ایک ٹرے پر کارن فلور بچھا دیں۔ اب مچھلی کے ٹکڑوں کو کارن فلور میں ڈپ کریں اور پھر گرم گھی میں فرائی کر لیں۔ مزیدار مچھلی تیار ہے

اسپرنگ فرائیڈ فش

اشیا: مچھلی بغیر کانٹے والی ایک کلو، انڈہ ایک عدد، لیموں دو عدد، سویا ساس 2 ٹیبل سپون، لہسن کچلا ہوا 5 جوئے، کارن فلور آدھی پیالی، ہرا دھنیا ایک پیالی، بریڈ کرمبز آدھی پیالی، مونگ پھلی کا تیل 2 ٹی سپون، ہری پیاز (چوپ کی ہوئی) ایک پیالی، شکر ایک چائے کا چمچ، ہری مرچ 3 عدد، لال مرچ کٹی ہوئی 1 کھانے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، گرم مصالحہ ایک کھانے کا چمچ، ٹماٹر 1 (چوپ کیا ہوا)۔

ترکیب: کارن فلور، بریڈ کرمبز انڈہ اور سویا ساس ان سب کو ہلکا سا پانی کا چھینٹا دے کر مکس کر لیں مچھلی کے حسب منشا قتلے کاٹ لیں اور ان پر لہسن، نمک، شکر، آدھی لال مرچ اور ایک لیموں کا رس لگا کر آدھے گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔ پھر اس مچھلی کو کارن فلور والے میٹریل میں ڈبو کر ڈیپ فرائی کر لیں۔ گولڈن براؤن ہونے پر نکال لیں ایک فرائی پین میں مونگ پھلی کا تیل ڈالیں اس میں پیاز ڈال کر فرائی کریں۔ پھر ٹماٹر ڈال کر فرائی کریں، پھر اس میں ایک ٹی سپون نمک، باقی بچی ہوئی لال مرچ، ہری مرچ، چوپ کی ہوئی ہری پیاز، ہرا دھنیا اور گرم مصالحہ ڈال کر فرائی کریں۔ اس میں مچھلی کے قتلے رکھ دیں اور مصالحے میں اچھی طرح مکس کر دیں اور فوراً آگ سے اتار لیں۔ مزے دار مچھلی تیار ہے۔

فش سوپ

اشیا: مچھلی کا گوشت ایک پیالی، سرکہ 3 کھانے کے چمچ، سویا ساس 2 کھانے کے چمچ، پانی 3-2 جگ، نمک حسب ذائقہ،

کالی مرچ 1 کھانے کا چمچ ، ہری مرچ 2 عدد (چوپ کرلیں) گاجر 2 عدد (کدوکش کر لیں)، بند گوبھی کٹی ہوئی (ایک پیالی)، کارن فلور 1 پیالی، انڈے 2 عدد۔

ترکیب: مچھلی کے گوشت کو ہلکا سا نمک اور کالی مرچ ڈال کر اُبال لیں ۔ جب اُبل جائے تو کانٹے الگ کرلیں ۔ اب اس یخنی میں (جس پانی میں مچھلی کو اُبالا ہے) سرکہ، سویا ساس نمک، کالی مرچ اور مچھلی کے گوشت کے چھوٹے ٹکڑے کر کے ڈال دیں اور 3 جگ پانی ڈال کر پکنے دیں ۔ گاجر چھیل کر کدوکش کرلیں ۔ گاجر بھی شامل کر دیں ۔ جب بڑے بڑے اُبال آنے لگیں تو انڈے پھینٹ کر ڈالیں ۔ چمچہ برابر چلاتی رہیں ۔ ہری مرچیں شامل کر دیں ۔ کارن فلور کو پانی میں گھولیں اور تھوڑا تھوڑا کر کے سوپ میں شامل کریں اور سوپ میں چمچہ چلاتی رہیں ۔ پھر اس میں بند گوبھی ڈال کر اُبال دیں اور گرم گرم سرو کریں۔

(عنزہ عثمان)

سوجی کی پنجیری

اشیا: سوجی ایک پاؤ، دودھ ایک پاؤ، چینی ایک پاؤ، سوکھا دودھ ایک پیکٹ، انڈے دو عدد، چھوہارے 10 عدد، سبز الائچی 5 عدد، پستہ، بادام، اخروٹ، کشمش حسب پسند، گھی ایک پاؤ۔

ترکیب: چھوہارے دودھ میں بھگو کر رکھ دیں ۔ سوجی، چینی اور دودھ اس کو ملا کر مکسچر بنالیں جو نہ بہت پتلا ہو نہ بہت گاڑھا۔ اب کڑاہی میں تیل گرم کریں جب گھی اچھی طرح کڑ کڑا جائے تو احتیاط سے سارہ آمیزہ اٹھا کر اس میں شامل کر دیں آنچ دھیمی رکھیں اب اسے پلٹے کی مدد سے بھونتی رہیں جب حلوہ سنہری مائل ہو جائے تو اس میں انڈے اور سوکھا دودھ شامل کر دیں تھوڑا اور بھونیں جب خوشبو آنے لگے تو اس میں چھوہارے اور باقی سب میوے شامل کر دیں اور اتار لیں۔

لاہوری حلوہ

اشیا: سوجی ایک پیالی، چینی ایک پیالی، زردا رنگ ایک چمچ، چھوٹی الائچی 5 عدد، زیرہ بھون کر پیس لیں 1 چمچ ، بادام 10 عدد (بھیگے ہوئے) پستہ 20 عدد بھیگا ہوا۔

ترکیب: تیل میں الائچی اور زیرہ پاؤڈر ڈال کر گرم کریں پھر اس میں سوجی ڈال کر بھون لیں سوجی نکال لیں گھی میں پانی اور چینی ڈال کر شیرا بنالیں جب شیرا بن جائے تو اس میں بھنی ہوئی سوجی ڈال دیں اور زردا رنگ بھی شامل کر دیں جب پانی خشک ہو جائے اور حلوہ کڑاہی کو چھوڑنے لگے تو اسے ڈش آؤٹ کرلیں اور اوپر پستہ بادام ڈال کر سجا کر پیش کریں۔

(شازیہ مشتاق)

دلیہ سوپ

اجزا: دلیہ (تیار ڈبے والا جو یا گندم کا) ایک کپ، چکن، ایک پاؤ، کنور چکن کیوب آدھا حصہ، پیاز ایک عدد چھوٹا، نمک حسب ذائقہ، کالی مرچ پسی ہوئی حسب ذائقہ، پانی، آئل ¼ کپ۔

ترکیب: پیاز کو تھوڑے سے آئل میں براؤن کریں پھر نمک، کالی مرچ، کنور چکن کیوب اور چکن ڈال کر بھون لیں پھر دلیہ ڈال کر بھونیں 5 منٹ بعد تقریباً 4 کپ پانی ڈال کر چکن کو اور دلیے کو گلا لیں ہلکی آنچ پر کہ چکن بالکل ریشہ ریشہ ہو جائے پھر حسب پسند پانی ڈال کر پتلا کرلیں یہ بچوں کی فیورٹ ڈش

ہو گی اور مریضوں کے لئے طاقتور۔ذائقے کے لئے دہی ، لیموں یا چاٹ مصالحہ چھڑک سکتے ہیں۔

ٹوٹکے

ا۔پھٹکری بہترین (Antiseptic) ہے اس کا سفوف واش روم میں رکھیں نہانے کے بعد بغلوں میں لگانے سے پسینے کی بدبو ختم ہو جاتی ہے اور یہ مسّوں کے خاتمے کیلئے اکیسر ہے دن میں تین مرتبہ مسّوں پر لگائیں آدھے گھنٹے بعد پانی سے دھولیں بڑے مسّے جھڑ جائیں گے اور چھوٹے غائب ہو جائیں گے آزمایا ہوا نسخہ ہے۔

۲۔اگر کوکر بہت زیادہ جل جائے یعنی سالن پیندے پر لگ جائے تو اس میں دو گلاس پانی ڈالیں ایک چمچ میٹھا سوڈا اور ایک پیاز کاٹ کر ایک دو ابال آنے دیں پھر چمچ سے اتار لیں آسانی سے لگا ہوا سالن اتر جائے گا اور کوکر صاف ہو جائے گا۔

(مہوش احسان۔لیہ)

☆☆☆

میرا تجربہ

آلو کے چپس خستہ رکھنے کے لیے

آلو کے چپس لفافے میں بند کر کے لفافہ برف کے خانے میں رکھیں تو چپس نہ صرف خستہ رہیں گے بلکہ خراب بھی نہیں ہوں گے۔

چاولوں کی حفاظت کا طریقہ

چاولوں کو کیڑے سے بچانے کے لیے ان میں ڈیڑھ کلو باریک نمک ملا دیں یہ ایک من چاولوں کے لیے کافی ہے جبکہ بیس کلو چاولوں میں ایک چھٹانک ہلدی ذرا سا تیل ملا کر ڈالنے سے بھی چاول محفوظ رہیں گے اور ہلدی کا رنگ چاول دھوتے ہوئے اتر جائے گا۔

پیاز کے آنسوؤں سے بچاؤ کا طریقہ

پیاز کو کاٹنے سے پہلے اس کا چھلکا اتارنے کے بعد اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے تھوڑی دیر پانی میں بھگو دینے سے آنکھوں میں پانی نہیں آتا جبکہ پیاز کو الٹا کاٹنے سے بھی پیاز کاٹتے وقت آنکھوں سے آنسو نہیں بہتے۔ پیاز کو رات کو فرج میں رکھ دیں صبح اسے کاٹ لیں تو آنسو نہیں بہتے۔

پکے ہوئے کھانے کا نمک کم کرنے کا طریقہ

کاغذ کا ٹکڑا سالن میں ڈالنے سے نمک کم ہو جائے گا یا ایک آٹے کا پیڑہ بنا کر شوربے میں ڈال دیں نمک کم ہو جائے گا۔

پھلوں کو زیادہ عرصہ رکھنے کے لیے

پھلوں پر لیموں کا عرق چھڑک دینے سے پھل کافی عرصہ تک تازہ رہتے ہیں۔

ٹوٹے ہوئے انڈوں کو ابالنے کے لیے

ٹوٹے ہوئے انڈے کو ابالا جائے تو انڈے کا اندرونی مواد باہر نکل آتا ہے۔ اگر انڈوں کو ابالنے سے پہلے پانی میں تھوڑا سا سرکہ ملا لیں تو انڈہ نہ صرف اچھی طرح ابل جائے گا بلکہ اس کا اندرونی مواد بھی باہر نہیں آئے گا۔

پاؤں میں پسینہ آنے کی صورت میں

جوتا پہننے سے پہلے پاؤں کے تلووں پر پسی ہوئی پھٹکڑی لگانے سے پاؤں میں پسینہ نہیں آئے گا۔ اس کے علاوہ لائننگ پیپر کا تلا بھی رکھا جا سکتا ہے۔

بچوں کے دودھ کے دانت

بچے جب پہلی بار دانت نکالتے ہیں تو انھیں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ان کے مسوڑھے پھول کر سخت ہو جاتے ہیں۔ اس لیے مسوڑھے پر نیم گرم گھی کی مالش روز کر دیا کریں دانت آسانی سے نکل آئیں گے اور مسوڑھے بھی ٹھیک رہیں گے۔

مچھر سے بچاؤ

اگر جسم کے کھلے حصوں جیسے ہاتھ منہ سر پیر وغیرہ پر سرسوں کے تیل کی مالش کر لیں تو مچھر قریب نہیں آتا۔ اس

کے علاوہ اگر کمرے میں موم بتی یا اگربتی جلا دیں تب بھی مچھر بھاگ جاتا ہے۔ مچھر کے نروس سسٹم کو خوشبو اور بدبو دونوں ہی متاثر کرتے ہیں۔

بچوں کے پیٹ کے کیڑے

ان سے بچنے کے لیے رات سوتے وقت بچوں کو دو تین اخروٹوں کا مغز روز کھلائیں تو پیٹ کے کیڑے فضلے کے ساتھ نکل جائیں گے۔

❁❁❁